ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

July - 1988

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۳ ______ شمارہ نمبر ۷

جولائی ، ۱۹۸۸ء

• مدیر مسئول ______ نور محمد فلاحی

• مرتب ______ ولی اللہ سعیدی فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

• سالانہ زر تعاون	....	۳۰ روپئے
• خصوصی تعاون	....	۱۰۰ روپئے
• غیر ممالک سے	....	۱۵ امریکی ڈالر
• فی شمارہ	....	۳ روپئے

پتہ ترسیل زر کا : دفتر ماہنامہ مجلّہ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح ، بلریا گنج ، اعظم گڑھ ۔ یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پریس ، بڑے جال پریس دہلی ______ کاتب ، رفیق احمد ، شاہ پور ، اعظم گڑھ

ایں سعادت بزور بازو نیست

موسم حج قریب آچکا ہے۔ حجاج کرام سفر حج کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ کتنے خوش قسمت ہیں وہ افراد جنھیں اللہ تعالیٰ نے یہ سعید موقع عنایت فرمایا ہے۔ اور کتنے فرحاں وشاداں ہیں وہ دل جن کی دیرینہ آرزوئیں برآنے کو ہیں۔ شمع حق کے پروانے دنیا کے گوشے گوشے سے شمع حق کی طرف چلے جارہے ہیں۔ ہر ایک جلد از جلد دیار حبیب تک رسائی کے لئے بے چین ہے۔ آج انھیں دعاؤں کی سوغات، محبت بھرے جذبات اور حسرت بھرے احساسات کے ساتھ رخصت کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کتنے ایسے سینے ہیں جو ہر آن تڑپ رکھتے ہیں اس جانب پہنچنے کی۔ ہر حال موسم حج کے آنے اور خوش نصیبوں کے سوئے حرم جانے سے ان کے جذبات دو آتشہ ہوئے جاتے ہیں۔ لاکھوں اشک بھری نگاہیں زائرین حرم کی سمت اٹھتی اور معابعد آنسوؤں سے لبریز ہوکے جھک جاتی ہیں۔ اگر کوئی تمنا دل میں ہے تو بس یہی کہ اے کاش! میں بھی آج ساتھیوں کے ساتھ پابہ رکاب ہوتا۔ ہر مسلمان اپنے دل میں ایسے ہی جذبات رکھتا ہے۔ یہی ایمان کا تقاضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام کو یہ موقع عنایت کرے۔ (آمین)

اسلام اجتماعیت کا دین ہے۔ یہ دین انسان کو ہر وقت یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم اس دنیا میں تنہا نہیں ہو بلکہ تمہارے ساتھ زندگی گزارنے والے دوسرے اور لوگ بھی ہیں۔ ان سے بہترین تعلقات قائم رکھنا، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور اعمال صالحہ سے متصف ہونے کے بعد ان کو بھی اس جانب ترغیب دینا تمہاری ذمہ داری ہے۔ خوشی ہو یا غم، تمہیں ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ برابر کا شریک رہنا ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کا یہی تقاضا ہے۔ ہمارا پانچوں وقت مسجد میں جمع ہونا، کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا، مکمل ایک مہینہ تک تمام لوگوں کا روزے کی حالت میں زندگی گزارنا، عید اور بقرعید کے موقع پر ایک دوسرے کے ساتھ اجتماعی خوشی

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ
ایں سعادت بزور بازو نیست — مرتب — ۳
بحث ونظر
مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بعض خیالات پر اعتراضات کا جائزہ — نسیم ظہیر اصلاحی — ۵
مقالات
ابن قتیبہ — تیسری صدی ہجری کا متکلم اسلام — توقیر عالم فلاحی — ۲۴
سید قطب شہیدؒ کی قرآنی خدمات — عبید اللہ فہد فلاحی — ۳۵
تعلیم وتعلم
ابن فارس اور معجم مقاییس اللغۃ — ولی اللہ سعیدی فلاحی — ۵۲
نشریات انجمن
رپورٹ اجلاس شوریٰ انجمن طلبۂ قدیم — جاوید اشرف فلاحی — ۴۲
شعر ونغمہ
ایک پیغام — منصف مبارکپوری — ۴۲
حلقۂ یاراں
سرفراز فلاحی۔ منور حسین فلاحی۔ نظام الدین فلاحی — ۵۵
اخبار علمیہ
علمی دنیا کی اہم خبریں — ادارہ — ۵۷
جامعہ کے لیل ونہار
جمعیۃ الطلبہ کا انتخاب نو — مرتب — ۵۹

منا اور حج کے موقع پر دنیا کے کونے کونے سے مسلمانانِ عالم کا ایک جگہ اکھٹا ہونا اس کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان فرض عبادات تک میں بھی انفرادیت کو گوارا نہیں کیا جب کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ عبادت انسان کا ذاتی مسئلہ ہے۔

اجتماعیت کا نظام نافذ کر کے اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مقصد وجود میں کامیاب ہونے اور اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہوتے ہیں اجتماعیت ہمارے لئے صد درجہ ممد و معاون ہے کہ اگر انفرادیت کی زندگی گزارنی ہوتی تو زندگی میں نہ تو وہ دلکشی اور رعنائی ہوتی اور نہ ہی وہ سہولیات ہوتیں جو اس وقت فراہم ہیں۔

آج ہم اپنے فرضِ منصبی کو پورا کرنے میں بری طرح ناکام ہیں۔ خلقِ خدا ہم سے متنفر ہے۔ ہم اجتماعیت پسند دین کے علمبردار ہیں لیکن ہماری زندگیاں اس سے یکسر عاری نظر آتی ہیں۔ دوسروں کو اپنی طرف بلانا تو دور ہم خود آپس میں دست و گریباں ہیں۔ ہمارے یہاں اجتماعیت و اتحاد مفقود ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے دین کو کما حقہ تسلیم نہیں کیا؟ یا اس کے تقاضوں کی تکمیل میں ہم نے کوتاہیاں کی ہیں؟ ہم تمام کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اتحاد و اتفاق کی توفیق دے۔ آمین۔ واللہ ولی التوفیق۔ ••

"انسان کے لئے تعلق باللہ ضروری ہے۔ اسلام نے تعلق باللہ کا رشتہ ایک طرف علم اور دوسری جانب عمل سے جوڑا ہے اور ہدایت کی کہ اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ذکرِ الٰہی ہوتا رہے۔ اس میں جگہ کی قید ہے نہ وقت کی۔ اس نے باقاعدہ عبادت کو بھی ہر پہلو سے واضح اور متعین کر دیا۔"

(اقبال کے حضور — سید نذیر نیازی)

قسط ۱

مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بعض خیالات پر اعتراضات کا جائزہ

نسیم ظہیر اصلاحی غازی — مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر

ماہنامہ "حیاتِ نو" بیراگنج، اعظم گڑھ، کے شمارہ ماہ مئی ۱۹۸۷ء اور ماہ جون و جولائی ۱۹۸۷ء کے مشترک شماروں میں ہمارے محترم دوست جناب رضی الاسلام صاحب ندوی (علیگڑھ) کا ایک مضمون "مناسکِ حج کی تاریخ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کا مقصد تاریخ و تحقیق کے بجائے "ترجمان القرآن" علامہ حمید الدین فراہیؒ کے ان خیالات و تحقیقات کا تنقیدی جائزہ ہے جنھیں مولانا فراہیؒ نے سعی بین الصفا والمروہ، حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے متعلق حضرت ابراہیمؑ کے خواب اور "رمی جمار" کی حقیقت وغیرہ کے سلسلہ میں اپنی دو اہم تصانیف "ذبیح کون ہے" اور "تفسیر سورۂ فیل" میں پیش کیا ہے۔

قرآن کریم کے ایک معمولی طالب علم اور دبستان فراہیؒ سے دلی نسبت و تعلق رکھنے کی وجہ سے راقم نے ان تنقیدات کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا اور مولانا فراہی کی تحقیقات نیز دوسرے مراجع کی روشنی میں جب ان پر غور کیا تو اپنے عزیز دوست کے خیالات سے اتفاق نہ کر سکا۔ مجلہ "حیاتِ نو" نے رضی الاسلام صاحب کے اعتراضات شائع کئے ہیں اس لئے راقم نے بھی ضروری سمجھا کہ اپنی تحقیق کے نتائج اور معترض کے خیالات سے عدمِ اتفاق کے اسباب پیش کر دے تاکہ اہلِ علم ان پر بھی غور کر لیں۔

سعی بین الصفا والمروہ

فاضل معترض لکھتے ہیں:

"صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے بارے میں مشہور قول یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ کے اس واقعہ کی یادگار ہے جب وہ پیاس کی شدت سے بے قرار ہو کر پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ کے درمیان دوڑی تھیں۔" علامہ فراہیؒ نے اس کا دوسرا پس منظر بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سعی کی رسم بھی اسی واقعۂ قربانی ہی کے ایک معاملہ کی یادگار ہے۔ حضرت ابراہیمؑ صفا کی طرف سے آئے اور جوشِ اطاعت و بندگی میں پوری مستعدی اور سرگرمی سے مروہ کی طرف بڑھے، سعی۔ سی معاملہ کی یادگار کی حیثیت سے ذریت اسماعیلؑ میں محفوظ رہ گئی .... چونکہ حضرت سارہؑ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ سے نفرت کرتی تھیں، ان کی خواہش تھی کہ حضرت اسماعیلؑ حضرت اسحاقؑ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کی وراثت میں شریک نہ ہوں، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو فاران کے بیابان کی طرف نکال دیا، حالانکہ یہ قصہ جس صورت میں ان کے صحیفوں میں بیان ہوا ہے اس میں اس قدر کھلا ہوا تضاد ہے کہ ہر صاحب نظر اس کو بالکل لغو قصہ خیال کرنے پر مجبور ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں کے حال پر ہے جنھوں نے یہ بیہودہ افسانہ یہود کی زبانی سن کر اس کو سچ باور کر لیا اور پھر اس کو سعی صفا و مروہ کے اسباب کے سلسلہ میں ایک مسلم و مصدق روایت کی حیثیت سے بیان کر دیا۔"

مولانا فراہیؒ کے مذکورہ بیان پر نقد کرتے ہوئے ہمارے دوست یوں رقمطراز ہیں:

"لیکن اسرائیلی صحیفوں میں کسی واقعہ کے بارے میں تضاد کا ہونا اس کے لغو ہونے پر دلیل نہیں ہے، خود مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "ذبیح کون" میں یہ ثابت کیا ہے کہ ذبیح کے بارے میں تورات میں زبردست تضاد ہے لیکن وہاں انھوں نے اسے لغو قرار دینے کے بجائے ان کی تنقیح کر کے صحیح بات پیش کی ہے۔ یہاں بھی ضرورت تھی کہ ان متضاد روایات میں تنقیح کر کے صحیح بات پیش کی جاتی۔"

علامہ فراہیؒ نے جس روایت کو بیہودہ افسانہ قرار دیا ہے وہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور خاص طور پر حدیث کا یہ حصہ صراحت کے ساتھ مرفوعاً ثابت ہے (حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی وجہ (یعنی حضرت ہاجرہ کی دوڑ) سے لوگ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں)

اس کے بعد انھوں نے اپنے خیال کو مختلف طریقوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ انھوں نے صحیح بخاری کی جس روایت کو موضوع قرار دینے پر اپنا زور صرف کیا ہے وہ

دراصل اسرائیلیات میں سے ہے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی لکھتے ہیں:

اس کا سلسلہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا (بجز چند خاص ضمنی فقروں کے) اس لئے وہ حضرت ابن عباسؓ کی اسرائیلیات میں سے ہے اور اس کا ثبوت آج بھی موجود ہے بخاری میں اس کے متعلق جو طویل حدیث ہے وہ بئر جرہم اور مکہ کے ذکر کے "مدراش" اور "تالمود" میں حرف بحرف موجود ہے[1]

بخاری میں روایت کے یہ الفاظ:	
قال ابن عباس: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فذلک سعی الناس بینھما[2]	حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی وجہ سے لوگ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔

ہمارے خیال میں راوی کا اضافہ ہے، اس لئے کہ بخاری کے اندر اسی باب میں روایت زیر بحث سے پہلے ایک اور مختصر روایت بھی اسی سلسلہ کی ہے جس میں امام بخاریؒ نے کثیر بن کثیر کا بیان نقل کیا ہے کہ وہ اور ان کے ایک ساتھی عثمان بن ابی سلیمان، سعید بن جبیر (جنھوں نے ابن عباسؓ سے روایت زیر بحث بیان کی ہے) کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے ان سے کہا:

أحق ما سمعنا فی المقام مقام ابراھیم ان ابراھیم حین جاء فی الشام حلف لامرأته ان لا ینزل بمکة ...... الخ	کیا مقام ابراہیم کے بارے میں ہم نے جو یہ بات سنی ہے سچ ہے کہ جب وہ شام سے آئے تو اپنی بیوی سے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ مکہ میں قیام نہیں کریں گے؟

اس آدمی کے کہنے پر حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ما ھکذا حدثنی ابن عباس لکن قال: اقبل ابراھیم باسمعیل وامه	حضرت ابن عباس نے اس طرح ہم سے نہیں بیان کیا ہے بلکہ انھوں نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیل اور انکی والدہ کو لائے ......

---

[1] سید سلیمان ندوی: ارض القرآن حصہ دوم ص ۳۹ ۱۹۱۵ء

[2] بخاری شریف، جلد کتاب الانبیاء باب یزفون النسلان فی المشی

فساق الحدیث بطوله[1] اس کے بعد پوری روایت بیان کی۔

یہاں روایت کے بارہ میں مطلقاً فرمایا کہ "لم یرفعه" روایت کے غیر مرفوع ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے اس لئے کہ (فساق الحدیث بطوله) سے مراد وہی روایت ہے جو اسی سند سے آرہی ہے اور جو یہاں زیر بحث ہے۔ محدثین کرام کا مشہور طریقہ ہے کہ جب وہ کوئی ایسی حدیث بیان کرتے ہیں جو مختلف سند والے ہوتی ہے تو ہر سند کے بعد متن کے اندر جو کمی یا زیادتی یا الفاظ کا جو فرق ہوتا ہے اسے غایت احتیاط کی بنا پر ہر سند کے ساتھ بیان کرتے جاتے ہیں اس لئے یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ ایک بار پوری روایت کو غیر مرفوع کہنے کے بعد اس کے چند خاص ضمنی فقروں کو مرفوع کہا جائے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو یقیناً وہاں "لم یرفعه" کے بعد اس کی وضاحت ہوتی مگر ایسا نہیں ہے۔ مزید برآں صحیح بخاری میں روایت زیر بحث کے بعد ایک دوسری طویل روایت اسی سند کی ہے اور ابن عباسؓ سے مروی ہے[2] مگر اس میں وہ فقرہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی (حدیث کی مستند کتابوں میں) اس کی دوسری متابع روایتیں جو دوسرے طرق سے ابن عباسؓ سے ہی مروی ہیں ان میں بھی مذکورہ بالا فقرہ کہیں نہیں ملا۔ جب ایک واقعہ بالتفصیل بیان کیا جا رہا ہے تو ایک روایت میں ایک فقرہ کا ہونا اور دوسری روایتوں میں نہ ہونا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

زیر بحث روایت اور خصوصاً اس میں سعی سے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کا بے بنیاد ہونا اس لئے بھی یقینی معلوم ہوتا ہے کہ جب ان سے سعی کی مشروعیت کا سبب دریافت کیا گیا تو انھوں نے اس کی جو وجہ بیان کی وہ اس سے مختلف ہے جو اس روایت میں مذکور ہے۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لخت جگر کو قربانی کے لئے لے جاتے ہوئے یہاں جس سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا سعی اسی کی یادگار ہے۔ روایت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

اخرج الطبرانی والبیہقی عن ابی الطفیل قال قلت لابن عباس یزعم قومک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سعی بین الصفا والمروة وانه سنة، قال صدقوا ان ابراھیم علیه السلام لما امر بالمناسک اعترض له الشیطان عند المسعی فسابقه فسبقه ابراھیم ثم ذھب به الی الجمرة العقبة ...... ثم تله للجبین[1]

طبرانی اور بیہقی نے ابو الطفیل (عامر بن واثلہ) سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا و مروہ کے درمیان سعی فرمائی اور یہ سنت ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ان کا خیال صحیح ہے جب حضرت ابراہیمؑ کو مناسک (قربانی) کا حکم دیا گیا تو (قربان گاہ جاتے ہوئے) مسعی کے پاس شیطان حائل ہوا اور ان سے آگے بڑھ جانا چاہا مگر وہ آگے بڑھ گئے۔ پھر اپنے نور نظر کو جمرۂ عقبہ کے پاس لے گئے ...... اور پیشانی کے بل اسے پچھاڑ دیا۔

اس روایت سے سابقہ روایت کی تردید ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے معاملہ میں حضرت ابراہیمؑ نے جس نمایاں سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا وہی سعی کی اصل بنیاد ہے۔ ہم سابق روایت کو اس لئے بنیاد نہیں مانتے کہ اس کی نوعیت ایک طویل داستان جیسی ہے جس میں راویوں کی طرف سے کمی بیشی اور حذف و اضافہ کا بین امکان ہے جب کہ اس دوسری روایت میں سعی کے سبب کے متعلق خاص طور پر سوال کا مختصر جواب مذکور ہے اس لئے اس میں کسی ترمیم و اضافہ کا امکان کم ہے علاوہ ازیں قرآن مجید کے اشارات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے اس لئے ہم اسی روایت کو بطور تائید تسلیم کرتے ہیں۔

فاضل دوست کی پیش کی ہوئی روایت کا اسرائیلی داستان ہونا اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مشہور مفسر قرآن امام فخر الدین رازیؒ نے اسے (روایة مشہورة) کہہ کر ذکر کیا ہے[2] وہ ایک

---

[1] ابن حجر عسقلانی، فتح الباری ۶/۳۰۰، ادارات البحوث العلمیہ مکہ مکرمہ

[2] بخاری شریف ج ۱، کتاب الانبیاء، باب یزفون النسلان فی المشی

---

[1] امام محمد بن محمد سلمان، جمع الفوائد ۱/۱۸۵ مطبوعہ خیریہ میرٹھ۔ جلال الدین سیوطی، الدر المنثور ۱/۱۶۱ یہ روایت مسند احمد اور المعجم الکبیر میں بھی ہے اور در منثور میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ [2] علامہ فخر الدین الرازی، تفسیر کبیر ۳/۱۳۹

اور جگہ ان روایتوں کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

وههنا مباحث تتعلق بالحكايات۔[1] یہاں ان داستانوں سے متعلق کچھ باتیں غور طلب ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

وقال القاضي أكثر الأمور المذكورة في هذه الحكاية بعيدة۔[2]	قاضی نے کہا کہ اس داستان میں درج اکثر باتیں دور از کار ہیں۔

اگر یہ روایتیں واقعی صحیح و ثابت ہوتیں جیسا کہ ہمارے عزیز دوست کا خیال ہے، تو نہ امام رازی انھیں "داستان" سے تعبیر کرتے اور نہ ہی قاضی کا یہ قول نقل کرتے کہ "اس میں مذکور اکثر باتیں دور از کار ہیں"۔ جب ان روایتوں کا معاملہ اس قدر مشتبہ ہے تو ان کے کسی خاص فقرہ یا جز کی صحت پر صرف اس لئے اصرار کرنا درست نہیں ہے کہ وہ بخاری میں ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ دوسری روایت سے اس کی تردید ہو رہی ہو اور خود قرآن کے اشارات بھی اس کے خلاف ہوں۔

دورِ نبوی میں بعض اسباب کی بنا پر کسی کو بین الصفا و المروہ کے بارے میں کچھ تردد و تامل ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی:

إن الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البيت أو اعتمر فلا جناح عليه أن يطوف بهما۔[3]	بیشک صفا و مروہ خدا کی یادگاروں میں سے ہیں پس جو کوئی خانۂ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اسکے لئے ان میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف کرے۔

جس کے بعد سارے شبہات دور ہو گئے۔

مذکورۂ بالا آیت میں صفا اور مروہ کو "شعائر اللہ" کہا گیا ہے۔ شعائر، شعیرہ کی جمع ہے جس کا مصدر شعور ہے۔ شعور کے معنی جاننا، تاڑ جانا اور محسوس کرنا ہیں۔ شاعر کو شاعر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ عام انسانوں کی بہ نسبت اشیائے کائنات کو زیادہ

---

[1] علامہ فخر الدین الرازی، تفسیر کبیر ۱۵۸/۲۶۔ [2] ایضاً ۱۳۶/۹۔ امام رازی نے غالباً ایک جگہ لکھا ہے "وفيها اباطيل"، مگر افسوس کہ ہم حوالہ نوٹ نہ کر سکے اور پھر تلاش کرنے پر سردست وہ عبارت نہ مل سکی۔

[3] القرآن الکریم، سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۸

گہرائی تک محسوس کرتا ہے اور اپنے اس تاثر و احساس کو موزوں اور مناسب الفاظ میں بیان کرتا ہے۔[1]

شعیرہ، قربانی کے اس جانور کو بھی کہتے ہیں جسے تھوڑا سا اس لئے کاٹ دیا جاتا ہے کہ اس علامت اور نشانات سے معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے۔ لسان العرب میں ہے:

الشعيرة هي البدنة المهداة سميت بذلك لأنه يؤثر فيها بالعلامات والجمع شعائر۔[2]	شعیرہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو قربانی کے لئے بھیجی جاتی ہے۔ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس جانور میں نشانات کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اس کی جمع شعائر ہے۔

ایک شاعر کہتا ہے:

نقتلهم جيلا فجيلا تراهم　　شعائر قربان بهم نتقرب

ہم دشمنوں کو نسلاً بعد نسلٍ اس طرح قتل کرتے ہیں گویا وہ قربانی کے جانور ہیں جنھیں بھینٹ چڑھا کر ہم خدا کا تقرب حاصل کرتے ہیں

اس لئے شعیرہ کے اصلی معنی علامت، نشانی اور یادگار کے ہوں گے۔[3] صفا اور مروہ کو شعائر اللہ کہہ کر اسی بات کی طرف ذہن منتقل کرنا مقصود ہے کہ انھیں دیکھ کر اور اس کا تصور کر کے اس کی یاد تازہ ہو جائے اور آدمی فوراً اس حقیقت کو تاڑ جائے کہ یہاں دینِ الٰہی کا ایک اہم اور بامعنی واقعہ پیش آیا ہے۔ یہاں حضرت ابراہیم اور ان کے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہما السلام نے فدویت و جاں نثاری کا بے نظیر واقعہ یادگار چھوڑا ہے۔ اسی لئے حج کے بیان میں کتاب و سنت میں شعائر اللہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور ان کی تعظیم و توقیر کی امت کو تلقین کی جاتی ہے: ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب۔

اگر لفظ شعائر کا یہ مفہوم سامنے ہو تو پھر اس پر اطمینان نہیں ہو سکتا کہ اس سے حضرت ہاجرہ کے پانی کے لئے دوڑنے اور چاہ زمزم کے ابل پڑنے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ واقعہ ایک کرامت اور خارقِ عادت امر تو ہو سکتا ہے مگر کوئی ایسی یادگار نہیں ہو سکتا جس سے خدا کی یاد

---

[1] ابن منظور، لسان العرب ۴/۴۰۹–۴۱۰ مادہ ش ع ر، دار صادر، بیروت۔ [2] ایضاً صفحہ ۴۱۴۔

[3] ایضاً۔ [4] امام رازی اور علامہ ابن جریر طبری نے بھی یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

اس طرح تازہ ہو جائے کہ انسان اپنے آپ کو اس کے اشاروں پر قربان کر دینے کے لئے ہمہ تن آمادہ ہو جائے۔ بلاشبہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور کارسازی تو ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی عجیب و غریب ندرت نہیں ہے جس سے اس کو اللہ کی نشانی قرار دیا جائے۔ اس طرح کے واقعات تو عام طور پر اولیائے کرام سے ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ جو لوگ عربی زبان کی خصوصیات سے اچھی طرح واقف ہیں وہ یہ کہیں گے کہ اگر اس آیت میں حضرت ہاجرہ کے واقعہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا تو یہاں شعائر کے بجائے کوئی اور لفظ استعمال ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے ہمارے نزدیک شعائر اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ "واقعہ ذبح" یہیں پیش آیا تھا۔ یعنی مروہ ہی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ کو خدا کی طرف سے اپنے محبوب بیٹے کی قربانی کا حکم ملا تو وہ فوراً اس کے لئے آمادہ ہو گئے، اور بیٹے سے بھی رائے لی تاکہ صبر و رضا میں وہ بھی برابر کا شریک ہو جائے۔ پس یہ مقام اس حیثیت سے خدا کی یادگار ہے کہ یہاں اسلام اور اطاعتِ الٰہی، صبر و تحمل، اطاعت و فرمانبرداری کا ایک عدیم النظیر واقعہ پیش آیا تھا۔ غور کیجئے یہ کتنی لگتی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت ہاجرہ کا پانی کی تلاش کے لئے دوڑنا اور ان کے تضرع پر چشمہ کا ابل پڑنا ہی یادگار ہے اور اس کے بالمقابل یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے کہ یہاں بندگی و اطاعت کا عظیم الشان اور عدیم المثال ثبوت پیش کیا گیا جیسا کہ روایتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ تو ان دونوں میں کون سی بات زیادہ دل کو لگتی اور شعائر اللہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے؟

ہم نے یہ جو کہا کہ صفا اور مروہ اس لئے خدا کی یادگار ہیں کہ واقعۂ ذبح یہیں پیش آیا تھا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا فراہیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ، سب نے تحقیق کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ مروہ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اصل قربان گاہ ہے۔ [1]

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ مقامِ قربانی مروہ ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "ذبیح کون ہے" میں اس پر نہایت مدلل اور محققانہ بحث کی ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے

[1] مولانا فراہیؒ "ذبیح کون ہے" ص ۳۴ تا ۵۷، علامہ شبلیؒ، سیرت النبی اول، ص ۱۳۹ تا ۱۴۱، علامہ سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، ہفتم ص ۲۴۹ تا ۲۵۱۔

البتہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر تاریخی طور پر مروہ کا موقعہ ذبح ہونا ثابت ہے تو پھر منیٰ میں قربانی کیوں کی جاتی ہے؟ اور صفا اور مروہ کے درمیان صرف سعی پر کیوں اکتفا کیا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب "رمی جمار" پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ کی کتاب سے انشاء اللہ ہم نقل کریں گے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر مناسک حج کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا تھا:

قفوا علی مشاعرکم فانکم علی ارث من ارث ابراھیم۔ [1]

(مناسک حج سیکھ لو اس لئے کہ تم اپنے باپ حضرت ابراہیم کی میراث کے امین ہو۔)

اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ سعی حضرت ابراہیمؑ کی یادگار اور سنت ہے نہ کہ حضرت ہاجرہ کی سنت۔ یہی وہ بنیادی نکتہ اور اہم حقیقت ہے جس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اسی سے تو دو غلطیاں پیدا ہو گئیں اور ایک داستان کو ہی حقیقت سمجھ لیا گیا۔ آخر حضرت ہاجرہ کی وہ کون سی اہمیت و خصوصیت تھی جس کی بنا کر ان کے اسی واقعہ کو رہتی دنیا تک کے لئے یادگار اور نمونہ بنا دیا گیا۔ وہ پیغمبر نہیں تھیں بلکہ ایک پاکباز، صابر و شاکر اور خدا کی فرماں بردار خاتون تھیں۔ کسی نبی کی بیوی یا ماں ہونے کا شرف تو متعدد عورتوں کو حاصل ہے مگر ان میں سے کسی کو ایسا امتیاز حاصل نہیں ہوا۔ اس حیثیت سے بھی غور کرنا چاہئے۔ حضرت ہاجرہ کا یہ عمل اپنے اندر کوئی بہت زیادہ معنویت بھی نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ ان کے بجائے کوئی بھی دوسری ماں ہوتی تو وہ بھی اپنی ممتا سے مجبور ہو کر اس وقت وہی کرتی جو حضرت ہاجرہ نے کیا تھا۔ اس بنا پر سعی کا حضرت ہاجرہ کے اس واقعہ کی یادگار ہونا عقلاً بھی موزوں اور مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے برعکس اگر سعی کو اس سرگرمی کی یادگار قرار دیا جائے جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے محبوب اور اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لئے لے جاتے ہوئے صفا و مروہ کے درمیان کیا تھا تو اس کا وزن اور اس کی اہمیت و معنویت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔

فاضل مقالہ نگار کے اطمینان کے لئے یہ عرض کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ مولانا فراہیؒ اور

[1] ابوداؤد، کتاب المناسک، باب موضع الوقوف بعرفۃ

ان کے تلامذہ اس رائے میں منفرد نہیں ہیں بلکہ قدمار میں علامہ ابن جریر طبریؒ بھی اسی امر کے قائل ہیں اور وہ سعی کو سنت ابراہیمی تسلیم کرتے ہیں۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنی تفسیر میں ان روایتوں کا ذکر سرے سے کیا ہی نہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ حضرت ہاجرہ کی سنت ہے حالانکہ طبقۂ مفسرین میں ان کا یہ خاص امتیاز ہے کہ وہ تاویل آیات و احکام آیات کے ضمن میں ہر طرح کی روایتیں نقل کر کے محاکمہ کرتے ہیں اور کسی ایک قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ علامہ موصوف رقم طراز ہیں:

وانما اعلم الله تعالیٰ ذکرہ بقولہ "ان الصفا والمروة من شعائر الله" عبادة المؤمنین ان السعی بینهما من مشاعر الحج التی سنها لهم وامر بها خلیله ابراهیم علیه السلام اذ سأله ان یریه مناسك الحج ...... فاذا کان صحیحا ان الطواف والسعی بین الصفا والمروة فی شعائر الله ومن مناسك الحج فمعلوم ان ابراهیم علیه السلام قد عمل به وسنه لمن بعده، وقد امر نبینا صلی الله علیه وسلم امته باتباعه۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے قول "ان الصفا والمروۃ" کے ذریعہ صرف یہ بتایا ہے کہ سعی بین الصفا والمروۃ ان مناسک حج میں سے ہے جن کو اس نے اپنے مومن بندوں کے لئے مقرر کیا ہے اور جن کا اس نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت حکم دیا تھا جب انھوں نے اللہ تعالیٰ سے مناسک حج سکھانے کی درخواست کی تھی...... اور جب یہ صحیح ہے کہ طواف اور سعی بین الصفا والمروہ شعائر اللہ اور مناسک حج میں سے ہیں تو معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اسے کیا ہے اور بعد والوں کے لئے مسنون قرار دیا ہے۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس کے اتباع کا حکم فرمایا ہے۔

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ ان سے وہی بات معلوم ہوتی ہے جسے ہم پہلے حضرت

[1] علامہ ابن جریر طبری، تفسیر طبری ۲/۲۳ مطبوعہ مصطفی البابی الحلبی ۱۹۵۸ء

ابن عباس کی اس روایت کے حوالے سے نقل کر چکے ہیں جو ابو الطفیل کے واسطے سے مروی ہے:

ان تصریحات کے بعد مولانا فراہیؒ پر فاضل مقالہ نگار نے جو نقد و اعتراض کیا تھا وہ رفع ہوگیا اب رہی اسرائیلی روایت، تو ان میں تنقیح کی ضرورت نہیں کیونکہ اس سلسلہ میں یہودیوں سے ہمارا جھگڑا نہیں ہے۔

مناسک حج کی جو غرض و غایت اور مصلحت و حکمت احادیث نبوی میں بیان ہوئی ہے اس سے بھی یہی مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ سعی سنت ابراہیمی ہے۔ صحاح ستہ کی مشہور کتاب سنن نسائی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

انما سعی رسول الله صلی الله علیه وسلم بین الصفا والمروة لیری المشرکین قوته۔ [1]

صفا اور مروہ کے درمیان اللہ کے رسولؐ نے صرف اس لئے سعی فرمائی کہ تاکہ مشرکین کے سامنے اپنی طاقت و قوت کا مظاہرہ کریں۔

اسی کے ہم معنی ایک اور روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے جس کی تخریج ابن ابی شیبہ، ابو داؤد، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام بیہقی نے اس کو شعب الایمان میں اس طرح نقل کیا ہے:

عن عائشة قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انما جعل الطواف بالبیت والسعی بین الصفا والمروة ورمی الجمار لاقامة ذکر الله لا لغیره۔ [2]

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کا طواف، سعی بین الصفا والمروہ اور رمی جمار وغیرہ محض ذکر الٰہی کے قیام کے لئے بنائے گئے ہیں ان کا دوسرا کوئی مقصد نہیں۔

ان حدیثوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کا طواف، سعی بین الصفا والمروہ اور رمی جمار کی خواہ جو بھی حقیقت ہو لیکن بحیثیت مناسک حج ان کا خاص مقصد یہ ہے کہ اس موقع پر

[1] محمد بن محمد بن سلیمان۔ جمع الفوائد ۱/۱۸۳ مطبع خیریہ میرٹھ

[2] امام جلال الدین السیوطی، درِ المنثور ۱/۱۶۱

اپنی جمعیت، وحدت اور طاقت و قوت کا مظاہرہ کر کے دشمنانِ خدا کو مرعوب کیا جائے اور غلبۂ دینِ حق اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جوشِ فدویت و جانبازی اور جذبۂ ایثار و قربانی کا خدا کے حضور اقرار و اظہار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مصلحت و حکمت کا خاطر خواہ اور دل نشیں نقشہ اسی وقت حجاجِ کرام کے دلوں پر مرتسم ہو سکتا ہے جب سعی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت قرار دے کر تسلیم کیا جائے کہ یہ ان کے جوشِ اطاعت و بندگی میں پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ صفا سے مروہ کی طرف اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کے لیے لے جانے کی یادگار ہے۔ اگر اس کو حضرت ہاجرہ کی بے تابانہ دوڑ کی یادگار قرار دیا جائے تو اس صورت میں اس کا مقصد صرف تذلل اور بے چارگی کا اظہار ہوگا جیسا کہ امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے[1] مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی نے سعی کی جو مصلحت و حکمت بیان کی ہے اسے یہاں نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"صفا اور مروہ کے درمیان کی سعی اس عزم کا اظہار ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہم السلام کا راستہ ہی ہمارا راستہ بھی ہوگا اور اس راستہ پر چلنے میں ہم اپنے قدموں کو سست نہ ہونے دیں گے۔ انھوں نے اس سرزمین پر اپنے عمل سے اسلام کی جو شرح کی تھی ہمارے نزدیک بھی اسلام اس سے کم کسی چیز کا نام نہ ہوگا۔ مروہ کی شہادت گاہ تک بار بار دوڑ کر پہنچنا صرف یہ ذہن نشین کرانے کے لیے ہے کہ ہمارے سفرِ حیات کا آخری مرحلہ بھی ایسی ہی کوئی شہادت گاہ ہونی چاہیے۔"[2]

قربانی کی حقیقت

مقالہ میں دوسرا اعتراض قربانی کے سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب سے متعلق ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "ذبیح کون ہے" میں واقعۂ قربانی پر بحث کرنے سے پہلے "رؤیا" کے متعلق چند اصولی باتیں لکھی ہیں انہی کی روشنی میں فاضل مقالہ نگار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "مولانا فراہیؒ کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو خواب دکھایا گیا تھا وہ عملی نہیں تمثیلی تھا اور اس سے مراد یہ تھی کہ وہ اپنے لختِ جگر کو خانۂ کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیں، مگر حضرت ابراہیم نے خطائے اجتہادی کی بنا پر اس کو عملی خیال کیا

---

[1] فخر الدین رازی، تفسیر ابن کثیر ۱۳/ ۱۵۸۔ [2] مولانا صدر الدین اصلاحی: اسلام ایک نظریہ، صفحہ ۱۲۶، طبع ۱۹۹۴ء

اس لیے بعینہٖ اس کی تعمیل کرنے پر آمادہ ہو گئے"۔ اس کے بعد فاضل مقالہ نگار نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ نقطۂ نظر عام علماء نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ مولانا فراہیؒ اپنے اس خیال میں منفرد ہیں اور ان کا یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے"۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ فاضل مقالہ نگار کو خواہ مخواہ یہ مغالطہ ہو گیا ہے کہ "مولانا فراہیؒ کے خیال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے خواب کی تعبیر سمجھ سکے تھے"۔ مقالہ نگار اس میں مولانا کو منفرد بتاتے ہیں۔ اس لیے ذیل میں اس کی حقیقت واضح کی جاتی ہے اور مولانا کے نقطۂ نظر کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

غالباً فاضل مقالہ نگار نے صرف مولانا کی کتاب "ذبیح کون ہے" کو مدنظر رکھا ہے جس میں مولانا نے "رؤیا" سے متعلق محض چند اصولی باتیں تحریر فرمانے پر اکتفا کیا ہے، ورنہ ان کا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے خواب کی تعبیر اتنی دقیق تھی کہ خود وہ بھی اسے سمجھ نہیں سکے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی اس تصنیف میں نہ اس کی کوئی صراحت فرمائی ہے اور نہ کسی دوسری کتاب میں اس طرح کی کوئی بات لکھی ہے۔ اس بارے میں انھوں نے اپنی نامکمل کتاب "التکمیل فی اصول التاویل" میں بھی کسی قدر بحث کی ہے جس کی بہترین ترجمانی مولانا سید سلیمان ندویؒ نے علامہ شبلیؒ نعمانی کی تصنیف سیرۃ النبیؐ جلد اول میں اسی بحث پر گفتگو کرتے ہوئے ایک مبسوط حاشیہ میں کی ہے[1] ذیل میں مولانا فراہیؒ کا بیان ملاحظہ ہو۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

وان ابراهيم عليه السلام لم يصبر للتاويل بل صدق الرؤيا التي رآها ولم يعمل رأيا ليأولها إلى مايكون أقرب إلى العقل و ذلك لانه قد نذر ان يجعل هذا لخدمة الرب و يقربه إليه	حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تعبیر کے درپے ہوئے اور نہ اس کے لئے توقف کیا بلکہ انھوں نے اپنے خواب کو بعینہٖ کر دکھایا اور عقل سے قریب تر اسکی تاویل کرنے کی کوشش و جستجو نہیں فرمائی۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ انھوں نے نذر مان رکھی تھی کہ ان کی یہ اولاد خدمتِ الٰہی کے لئے وقف ہوگی اور وہ اس کو

---

[1] شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ ۱/ ۱۳۷ (زیر حاشیہ)

فلما رأى انه يذبحه ظن ان الله تعالى لقبل قربانه واراد تحقيقه فخاف التأويل وأخذ بظاهر التأويل فهو قدوة في الأخذ بالظاهر إذا كان اقرب إلى كمال التعبد فكما هو عليه السلام قدوة اهل الظاهر فكذلك هو قدوة لاهل التدبر والنظر والاستدلال والعبد المخلص الطاعة يعصمه ربه من الزيغ سواء كان من أهل الظاهر أو أهل النظر وهم العلماء وان رأس العلم الخشية للرب تعالى .... (رياض في الاصل) استحسن منه هذا الفهم وكان ذلك ابتلاءً عظيماً كما قال تعالى ان هذا لهو البلاء المبين .... (رياض) [1]

بارگاہ خداوندی میں نذر کر دیے گئے۔ چنانچہ جب انھوں نے خواب میں اپنے نورِ نظر کو خود ہی ذبح کرتے ہوئے دیکھا تو سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی "قربانی" (نذر) کو قبول فرما لیا ہے۔ اور اب وہ ان سے "حقیقۃً" اس کی تعمیل چاہتا ہے اس لئے وہ تاویل و تعبیر سے باز رہے اور اسکی ظاہری حقیقت کو ہی تسلیم کیا۔ اس اعتبار سے وہ مفہوم ظاہر کو اختیار کرنے کے باب میں نمونہ ہیں جو حقیقت میں کمال تعبد سے قریب تر امر ہے پس جس طرح حضرت ابراہیمؑ اہل ظاہر کیلئے نمونہ ہیں اسی طرح وہ اہل تدبر اور اصحاب نظر و استدلال کے لئے بھی نمونہ ہیں اور اللہ تعالیٰ مخلص و اطاعت گزار بندے کی ضیع و ضلال سے حفاظت فرماتا ہے، چاہے وہ اصحاب ظواہر میں سے ہو یا اہل نظر یعنی علماء میں سے، اسلئے کہ علم کا کمال خوفِ الٰہی ہے۔ چنانچہ ان کے اس فہم و استدراک کو مستحسن قرار دیا گیا اور یقیناً یہ بہت بڑی آزمائش تھی جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (ان ہذا لہو البلاء المبین)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا فراہی کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اگر چاہتے تو اپنے اس خواب کی کوئی نہ کوئی تاویل کر لیتے مگر انھوں نے سرے سے اسکی

[1] مولانا فراہیؒ : التکمیل فی اصول التاویل ص۱۷

تاویل معلوم کرنے کے لئے کوئی توقف ہی نہیں کیا بلکہ چونکہ پہلے سے وہ یہ نذر مان چکے تھے کہ اپنی اولاد کو خدمت کعبہ کے لئے وقف کر دیں گے اس لئے ایک صداقت شعار اور وفادار بندہ ہونے کی بنا پر وہ اس کی کسی تعبیر و تاویل کے درپے نہ ہوئے بلکہ خواب کو حقیقت سمجھ کر اس کی من و عن تادیہ کرنے پر آمادہ ہو گئے، جو مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بقول "محبت الٰہی سے سرشاری اور غلبۂ شوق و اطاعت کا نتیجہ تھا"۔ [1]

اب جب یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی تو اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار نے جو اور باتیں لکھی ہیں وہ بلا ضرورت ہیں اس لئے ان سے تعرض کی کوئی حاجت نہیں، البتہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی عبارت پر نقد کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ ضرور قابل غور ہے۔ سیدؒ صاحب کی عبارت پر نقد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"انبیاء علیہم السلام کا خواب اگر تمثیلی ہو تب بھی وہ اس کی تعبیر سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور اللہ کے حکم پر عمل کرنے کے بجائے غلبۂ شوق و اطاعت میں اپنی طرف سے ایسا کام کرنا جس کا حکم اللہ نے نہ دیا ہو مستحسن نہیں۔"

یہ تو صحیح ہے کہ جس کام کا حکم اللہ تعالیٰ نے نہ دیا ہو اس کا کرنا مستحسن نہیں مگر اس کے باوجود انبیاء علیہم السلام کی زندگی میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ غلبۂ شوق و اطاعت کی بنا پر انھوں نے منشائے خداوندی کو نظر انداز کر دیا مثلاً موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد جگہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و ہدایات دینے کے لئے ایک مقررہ وقت کے لئے ان کو کوہ طور پر بلایا تھا۔ ابتداء میں اس کی مدت تیس دنوں کی مقرر کی گئی تھی تاکہ عبادت و ریاضت کے ذریعہ ان کے اندر کتاب الٰہی کے بار عظیم کے متحمل ہونے کی روحانی صلاحیت پیدا ہو، لیکن موسیٰ علیہ السلام غلبۂ شوق و اطاعت کی بنا پر وقت مقررہ سے دس دن پہلے پہنچ گئے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے دریافت کیا کہ اے موسیٰ تم اتنی جلدی کیوں چلے آئے، تو انھوں نے برجستہ جواب دیا:

[1] شبلی نعمانیؒ : سیرۃ النبیؐ ۱/۱۴۷

لیکن موسیٰ علیہ السلام غلبۂ شوق و اطاعت کی بنا پر وقت مقررہ سے دس دن پہلے پہنچ گئے چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے دریافت کیا کہ اے موسیٰ! تم اتنی جلدی کیوں چلے آئے تو انھوں نے برجستہ جواب دیا:

عجلت الیک رب لترضیٰ۔ [1]

اے مولا آپ کے حضور اسلئے جلدی چلا آیا تاکہ تو راضی ہو جائے

اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا پسند آئی اور اپنے حضور تیس دن کے بجائے چالیس دن رہنے کی اجازت عطا فرمائی۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

وواعدنا موسیٰ ثلثین لیلۃ واتممناھا بعشر فتم میقات ربہ اربعین لیلۃ۔ [2]

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اسکو پورا کیا دس راتیں بڑھا کر، اس طرح انکے رب کی مقررہ مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔

یہ بھی درست ہے کہ قدیم علماء میں اس خیال کے ماننے والے کم گزرے ہیں مگر اہل نظر و اصحاب تحقیق و اجتہاد سے یہ مطالبہ کرنا بےجا ہے کہ وہ بھی دوسروں کی رائے کو آنکھ بند کر کے مان لیں۔ مولانا فراہیؒ جس درجہ و مرتبہ کے محقق، ناقد اور مجتہد و بالغ نظر مفسر تھے اس کی بنا پر ان کو دوسروں کے غیر اطمینان بخش اقوال سے اختلاف کرنے کا پورا حق تھا علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل مولانا فراہیؒ کے ہی خیالات کی صدائے بازگشت ہے مگر چونکہ مولانا فراہیؒ کی تحقیق مکمل صورت میں قلمبند نہیں ہو سکی اس لئے ان حضرات نے ان کے نامکمل خیالات کو اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنے خیالات کا مؤید بعض اکابر صوفیاء کو بتایا ہے۔ [3] اور سید صاحبؒ نے اپنی تشریح میں اس خیال کو بعض علماء کی متابعت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ [4] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تینوں بزرگوں کے پیشوا متقدمین علماء اور محققین بھی رہے ہیں۔ چنانچہ متعدد تفسیروں میں بھی اس طرح کی باتیں مل جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو واقعی ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا مگر انھوں نے خواب کا یہی مطلب سمجھا اور اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ علامہ شوکانی کی فتح القدیر، قرطبی کی الجامع لاحکام القرآن

---

[1] القرآن الکریم: طٰہٰ: آیت ۸۴۔ [2] ایضاً: اعراف: آیت ۱۴۲

[3] شبلی نعمانی: سیرۃ النبی اوّل ص۱۲۵۔ [4] ایضاً: (زیر حاشیہ)

وغیرہ میں ہے:

وقال بعضھم ان ابراھیم علیہ السلام ما امر بالذبح الحقیقی الذی ھو فری الاوداج وانھار الدم وانما رأی انہ اضجعہ للذبح فتوھم انہ امر بالذبح الحقیقی۔ [1]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقیقۃً ذبح کرنے یعنی گردن کاٹنے اور خون بہانے کا حکم نہیں دیا گیا تھا بلکہ انھوں نے خواب میں صرف یہ دیکھا تھا کہ اپنے جگر گوشہ کو ذبح کرنے کے لئے لٹا دیا ہے۔ اس سے انھوں نے سمجھا کہ ان کو حقیقۃً ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قاضی ابوبکر ابن العربیؒ نے بھی اپنی کتاب "احکام القرآن" میں اس خواب کو کنایہ پر محمول کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

فقال ابراھیم لابنہ: رأیت انی اذبحک فی المنام فاخذ الوالد والولد الرؤیا بظاھرھا واسمھا وقال لہ افعل ما تؤمر، اذ ھو امر من قبل اللہ تعالیٰ لانھما علما ان رؤیا الانبیاء وحی اللہ واستسلما لقضاء اللہ، ھذا فی قرۃ عینہ وھذا فی نفسہ، اعطی ذبحاً فداءً وقیل لہ ھذا فداءک فامتثل فیہ ما رأیت فانہ حقیقۃ ما خاطبناک فیہ وھو کنایۃ لا اسم۔ [2]

ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں تو باپ اور بیٹے دونوں نے اس خواب کو اسکے ظاہر اور اصل پر محمول کیا اور بیٹے نے باپ سے کہا کہ آپکو جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اسے کر گزریئے کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے وجہ یہ تھی کہ دونوں کو اسکا علم تھا کہ انبیاء کے خواب وحی ہوتے ہیں چنانچہ حکم الٰہی کے سامنے دونوں نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا، انہیں سے ایک کا اپنے نور نظر کے بارہ میں اور دوسرے کا خود اپنی جان کے بارے میں تسلیم و سرفگندگی کا مظاہرہ تھا پھر حضرت ابراہیمؑ کو ذبح بطور فدیہ عطا کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ تمہارا فدیہ ہے اسلئے جو کچھ تم نے اپنے خواب میں دیکھا ہے اسکی تعمیل اسی میں کرو کیونکہ جو کچھ ہم نے تم سے خواب میں کہا ہے اسکی حقیقت یہی ہے اور یہ کنایۃً تھا نہ کہ اصلاً۔

---

[1] شوکانی: فتح القدیر ۴/۴۰۵۔ محمد بن احمد انصاری قرطبی: الجامع لاحکام القرآن ۱۵/۱۰۳

[2] قاضی ابوبکر ابن العربی: احکام القرآن ۴/۱۶۰۸ تحقیق علی محمد البجاوی دار المعرفہ بیروت

تاریخ وتفسیر کی اکثر متداول کتابوں میں بہت واضح طور پر ہے کہ جب ملائکہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ولد حلیم کی بشارت سنائی تو انھوں نے اسی وقت یہ نذر مان لی تھی کہ ان کی یہ اولاد "خدا کی ذبیح" یعنی خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف ہوگی۔ چنانچہ جیسے ہی بچہ بلوغ کے قریب پہنچا تو ان سے ایفائے نذر کا مطالبہ کر دیا گیا۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ملت ابراہیمی میں ذبیح یا قربانی کا مطلب نذر خدا میں نذر کرنا اور خدا کے گھر کی خدمت کے لئے وقف کرنا ہوتا تھا۔[1] بحر المحیط کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

قيل حين بشرت الملائكة بغلام حليم قال هو اذن ذبيح الله، فلما بلغ معه السعي قيل له وف بنذرك۔[2]

بیان کیا گیا ہے کہ جب ملائکہ نے حضرت ابراہیم کو ولد حلیم کی بشارت دی تو آپ نے فرمایا کہ تب میری یہ اولاد خدا کی "ذبیح" یعنی نذر ہوگی۔ چنانچہ جب بچہ بلوغ کے قریب پہنچا تو آپ سے مطالبہ کیا گیا کہ اب تم اپنی نذر پوری کرو۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا اصل منشاء ذبح کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ اپنے لخت جگر کو خدمت کعبہ کے لئے فارغ کر دیں۔ اس بحث کا ماحصل یہ نکلا کہ مولانا فراہیؒ نے ابراہیمؑ کے خواب اور قربانی سے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ کوئی نیا اور بالکل اچھوتا خیال نہیں ہے، گو یہ نقطۂ نظر عام علماء نے تسلیم نہیں کیا ہے تاہم مولانا فراہیؒ اپنے خیال میں منفرد بھی نہیں ہیں بلکہ ہر دور میں علماء کا گروہ اس کا قائل رہا ہے اور اب بھی ہے، اور یہی صحیح نقطۂ نظر بھی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(باقی ہے آئندہ)

---

[1] دیکھئے مولانا فراہیؒ کی "ذبیح کون ہے" صفحہ ۶۹-۶۸، اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبیؐ جلد ۴ ص ۲۲۶ اول ۱۳۶۰۔

[2] ابو حیان اندلسی، بحر المحیط ۷/۳۶۹ طبع ثانی ۱۹۸۳ء دار الفکر، حسین بن عبداللہ الدیار بکری، تاریخ الخمیس ۱/۱۰۸ طبع اول ۱۳۰۲ھ، ابن اثیر الکامل ۱/۱۱۱ دار صادر بیروت ۱۹۸۲ء

دوسری قسط:

توقیر عالم فلاحی

ابن قتیبہ

تیسری صدی ہجری کا متکلم اسلام

پانچویں چیز یہ ہے کہ الوہیت کے دلائل اور کائنات کے سلسلے میں مختلف مظاہر پر جو روشنی ڈالی گئی ہے اس سے روحانی قوت کو نمو ملتا ہے۔

چھٹی اور اتنی ہی اہم چیز یہ ہے کہ اسکے اندر جو بھی اثر انگیزی پائی جاتی ہے شعوری طور پر جذبات کو ابھارتی ہے اور دلوں میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے کیونکہ اسکا اسلوب نفس انسانی کو مخاطب اس طرح کرتا ہے گویا کہ وہ اسکے اسرار حیات سے واقف ہو۔[3]

ابن قتیبہ اعجاز قرآن سے متعلق ان امور کی وضاحت کے بعد الوہیت کے دلائل، کائنات کے اسرار و نوامیس کے بارے میں قرآن کی گویائی کا تذکرہ اور یوم آخرت کے مناظر پر تبصرہ کرتا ہے۔ ہاں یہ بات تو قابل ذکر ہے کہ اعجاز قرآن سے متعلق تمام مباحث پر ابن قتیبہ شرح و بسط کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے بلکہ مشکل القرآن سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے، لوگوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے اور صحیح ترین موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ضمناً اعجاز قرآن سے متعلق امور کی بھی وضاحت کرتے جاتے ہیں۔ اور ان تمام ہی توضیحات میں ابن قتیبہ کی دقت نظری اور حذاقت و مہارت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ مثلاً دینی مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے کائنات کی تخلیق کے مسئلے کو ایسی پر حکمت دلیلوں کے ساتھ واضح کرتے ہیں کہ

قاری یا سامع کے ذہن پر غیر جانبدار مرعوب کن شخصیت کے نقوش مترتب ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اوّل وہلہ میں تمام آسمانی کتابوں سے بحث کرتے ہیں اور پھر دلائل کے طور پر دوسری آسمانی کتابوں کی باتیں پیش کرتے ہیں۔ اسکے بعد مناسب تبصروں کے بعد اپنی رائے پیش کرتے ہیں" لیکن جو چیز ابن قتیبہ کو قرآنی خدمات میں ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ زبان و بیان کی آماجگاہ میں مرد مجاہد نظر آتے ہیں۔

"مشکل القرآن" میں ابن قتیبہ تشبیہ، استعارہ، قلب، ایجاز و اختصار اور متشابہات وغیرہ ادبی شقوں کو سامنے رکھتے ہوئے دوسروں کے شکوک و شبہات کو رفع کرتے ہیں۔ اور بالغ النظری و حکمت عملی کے ساتھ مخاطبین اور سامعین کو اپنی دلیلوں سے رام کر لیتے ہیں۔ ان تمام امور میں ابن قتیبہ کلام میں مجاز کے واقع ہونے کو بڑا اہم گردانتے ہیں۔" بلکہ انکے نزدیک مجاز کو وہی مقام ہے جو ابو عبیدہ کے نزدیک الفاظ و عبارات کے مدلول میں تحول کا ہوا کرتا ہے یعنی تقدیم و تاخیر کے وقت نظم کے مخالف ہونے، زیادتی اور نقصان کے واقع ہونے اور وضوح و غموض کے پائے جانے میں جو اہمیت ابو عبیدہ کے نزدیک ہے بعینہ ابن قتیبہ کے نزدیک کلام میں مجازات کے واقع ہونے کا مقام ہے۔

مجازی گفتگو کو جو لوگ بے حقیقت سمجھتے ہیں، انکے خلاف جنگ کرتے ہیں اور اس کے صحیح ہونے کے جو دلائل پیش کرتے ہیں انمیں ایک یہ بھی ہے۔ اگر مجاز کوئی جھوٹی اور بے حقیقت چیز ہوتی تو حیوان کی طرف منسوب ہونے والا ہر فعل باطل ہو جاتا اور اکثر و بیشتر باتیں فساد کا شکار ہو جاتیں۔ مثلاً یہ باتیں، نبت البقل، طالت الشجرۃ، اینعت الثمرۃ، ورخص الشعر وغیرہ۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجاز ایک ایسا ستون ہے جسکی موجودگی میں پیچیدہ ترین معاملات کا حل ممکن ہے۔

ابن قتیبہ مجاز سے متعلق بہت ساری آیتوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں اور جو لوگ بیجا تاویلات کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں یا شکوک شبہات کے دلدل میں پھنس کر

اپنے آپکو غلط فہمیوں کا شکار بنا لیتے ہیں، انکے سامنے کافی و شافی گفتگو ذہنی اور فکری طور پر بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بطور مثال چند قرآنی آیات زیر بحث لائی جاتی ہیں:۔

سورہ الانفطار میں ایک آیت ہے: "فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ" ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ اس آیت میں "آواگمن" یا "تناسخ" کی طرف اشارہ ہے۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں کسی ایک فرد کو نہیں، کسی ایک جماعت کو نہیں کسی ایک قبیلہ کو بھی نہیں بلکہ پورے بنی نوع انسان کو خطاب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ پوری انسانیت سے سورۃ الانشقاق کے اندر مخاطب ہے: "إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا" یہ اسی طرح ہے جیسے کہ کوئی فرد تمام انسانوں سے ان الفاظ میں گویا ہو۔ "يَا أَيُّهَا الرَّجُلُ" درحقیقت یہ ہے کہ خالق کائنات نے پوری انسانیت کی توجہات کو مرکوز کراتے ہوئے فرمایا کہ اس نے ہی تمہاری صورت گری کی، نوک پلک درست کی، اور جس شکل میں چاہا تمہیں بنا دیا۔ خواہ حسین و جمیل ہو قبیح و بدشکل، گورے چٹّے ہو یا کالے کلوٹے، گندمی رنگ کے ہو یا سرخ رنگ کے۔ قرآن کریم کی یہ آیتیں بھی ملاحظہ فرمائیں۔ "ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ" اور اللہ تعالیٰ کا قول جو جہنم سے ہوگا۔ "هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ"

پہلی آیت کے سلسلے میں معتزلیوں کا یہ خیال ہے کہ اسی میں محض زمین و آسمان کی تخلیق کی تعبیر ہے اور دوسری آیت میں جہنم کی وسعت سے خبر کرنا مقصود ہے بس یہ تعبیر تخلیق اور جہنم کی فراخی و کشادگی کی یہ خبر ماورائے عقل چیزوں کو ماننے کا محتاج نہیں بناتی ہے۔

ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ کیا کتاب اللہ میں اس قسم کی جتنی آیات بھی آئی ہیں اور احادیث رسولؐ میں جو کچھ بھی اس طرح کی باتیں پائی جاتی ہیں کیا تاویل کا جامہ پہنائے جانے سے عاجز ہیں۔ نہیں بات دراصل یہ نہیں ہے بلکہ حیرت و استعجاب کی صورت تو اسوقت پیدا ہوتی ہے جبکہ آسمان و زمین اور جہنم کی گویائی کے بارے میں شک و شبہ کو جگہ دی

جائے۔ اللہ تعالیٰ جسم کی کھالوں، ہاتھوں اور پیروں کو گویائی کی قوت بخش سکتا ہے، پہاڑوں اور پرندوں کو تسبیح خوانی کے لئے مسخر کر سکتا ہے۔ جہنم کو اس کے دہکتے شعلوں سے متغیظ کر سکتا ہے تو کیا وہ آسمان و زمین قدرت نہیں رکھ سکتا اور نار جہنم کو گویائی نہیں دے سکتا[22]

پھر وہ حدیث رسول کا ایک ٹکڑا اپنے موقف کی وضاحت میں پیش کرتے ہیں[23]
"ان النار تقول لربہا انک وعدتنی ملئی فیضع فیہا قدمہ فتقول: قط قط (معنی حسب) پھر فرماتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام پرندوں اور چیونٹیوں کی گفتگو کو سمجھتے تھے حالانکہ چیونٹیوں کی گفتگو سنی بھی نہیں جا سکتی۔ رؤبہ کہتا ہے:-

لو کنت قد أوتیت علم الحکل ۔ علم سلیمان کلام النمل[24]

اسی طرح کی بہتیری آیات ہیں جن کو ابن قتیبہ نے موضوع بحث بنا کر شکوک و شبہات میں پڑنے والوں اور دین و ایمان کو عقل کے تابع کرنے والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔ بڑی قابل ذکر بات یہ ہے کہ براہ راست کسی فرقہ یا جماعت کا نام لیکر اُنکی تاویلات کے ذکر سے احتراز کیا ہے۔ قرآن کی مختلف آیات کو ایک ہی آیت کی تعلیم کو ثابت کرنے کے لئے پیش کیا ہے۔ جگہ جگہ احادیث نبوی سے استدلال کیا ہے نیز عرب شعراء کے کلام کو بھی اپنے موقف کی تائید میں پیش کیا ہے اور ان تمام صورتوں اور مرحلوں میں دقت مطالعہ بالغ النظری اور حکمت عملی کی خصوصیات جھلکتی ہیں۔

"الاختلاف اللفظ والرد علی الجہمیۃ والمشبہۃ"

یہ کتاب ابن قتیبہ کی اہم ترین اور قابل قدر تصانیف میں سے ہے۔ ایک ادیب دلیل و برہان میں ابن قتیبہ کے اسلوب کی بلندیوں سے نقوش راہ حاصل کرتا ہے بشرطیکہ وہ اسکی خالص فلسفیانہ تعبیر کو دیکھے اور ان عبارتوں کا مطالعہ کرے جن میں اعتماد و وثوق اور جمعیت و تطبیق کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ایک فقیہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ابن قتیبہ اپنی اس تصنیف میں بہت نرم ہیں۔ شدت اور تیزی وہ نہیں ہے جو اصحاب رائے کو

خصومت کے نتیجے میں ہونا چاہئے۔ اس کتاب کے لکھنے کا محرک خاص کیا بنا؟ دو کلیان دائرۃ المعارف میں لکھتے ہیں: "ابن قتیبہ کے حریفوں نے چاہا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے کہ وہ اُنکے افکار و خیالات پر حملہ زنی کرنے سے باز آجائیں یہی وجہ ہے کہ ابن قتیبہ کی ذات کو کبھی کرامیہ کی طرف منسوب کیا گیا کبھی جہمیہ کی طرف پھر وہ ان الزامات سے اپنی ذات کو بری الذمہ قرار دینے کے لئے اس کتاب کی تصنیف پر آمادہ خاطر ہوا"[25]

یہ کتاب ایک طرف تو جہمیہ مشبہہ کے عقائد پر تنقید کر کے انکی مخالف اسلام سرگرمیوں کا توڑ کرتی ہے تو دوسری طرف ابن قتیبہ کے مناظرہ و مباحث اور فقیہ و فلسفی ہونے کی سند فراہم کرتی ہے۔ اس میں شک و تردد کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ نے تیسری صدی ہجری کے زوال ادبار میں عقیدے کی جنگ میں پیش پیش رہے لیکن یہ بھی ایک صداقت ہے کہ جنگ کے مراحل میں کبھی بھی آپ خود پرستانہ جذبات کے شکار نہیں ہوئے۔ حق و باطل، مستحسن و قبیح، جائز و ناجائز اور حرام و حلال کی حدوں کو پھلانگ نہیں لگایا۔ مخالفین سے نبرد آزما ہوتے ہوئے آپ کبھی آپے سے باہر نہیں ہوئے اور مناظرے و مباحثے میں ہر آن قرآن و حدیث کو ہی رشد و ہدایت کا سرچشمہ مان کر اس سنگلاخ وادی کو سر کرتے رہے۔

یہ کتاب: "الاختلاف فی اللفظ والرد علی الجہمیۃ والمشبہۃ" اس دور کے علماء و دیندار حضرات کی تنگ صحبتوں اور منافرتوں کی بھی نقاب کشائی کرتی ہے۔ اور انکے بے بنیاد جھگڑے اور بیجا اختلافات سے واقف کر کے دعوت فکر و نظر دیتی ہے[26] ابن قتیبہ اپنی اس تصنیف میں ان قرآنی آیات کو پیش کرتے ہیں جن کو موضوع بحث بنا کر اہل کلام نے اپنے جلووں کی [illegible] ہے۔ اور ان احادیث کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جن کی مختلف تاویلات کے ذریعہ اپنے مسلک کی بیجا حمایت کی گئی ہے۔ یہ اپنی تاویلات میں ان الفاظ کو معانی و مفاہیم کا جامہ پہناتے ہیں جو اصلاً ان کے لئے وضع نہیں کئے گئے ہیں۔ نتیجتاً اس مہم کو سر کرنے میں اہل کلام قرآن و حدیث کے معانی و مقصود سے دور ہو جاتے ہیں۔ ابن قتیبہ خالص اور مستند مختلف نصوص کا سہارا لیتے ہوئے ان کی دلیلوں کو رد کرتے ہیں۔ اس اثنا میں وہ عقل و فہم کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے بلکہ انکو مسائل کی عقدہ کشائی میں ایک خاص کا مقام دیتے ہیں۔ جگہ جگہ وہ علم توحید سے مدد لیتے ہیں، بالخصوص

اس وقت جب وہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے بحث کر رہے ہوتے ہیں پھر وہ ان کلامی نکتوں و توجیہات کو دوسری قرآنی آیات سے غلط ثابت کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ ابن قتیبہ نے اس کتاب میں اہل کلام کی من مانی تاویلات کو اور منتشر آراء و افکار کو بے نقاب کیا ہے نیز قرآن و حدیث اور مستند لغوی نصوص کے ذریعہ باطل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔ بطور مثال چند آئیں دیکھیں۔

فرمان باری تعالیٰ ہے: "فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا" اس آیت کریمہ کی تاویل کرتے ہوئے اہل اعتزال کہتے ہیں کہ: "رشد و ہدایت اور ضلالت و گمراہی خود بندوں کے اختیار میں ہے۔" اور اپنے اس قول کی سند و شہادت میں اللہ کو منصوب پڑھتے ہیں۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ: "ضلالت و ہدایت کے اختیار کو بندے کی طرف منسوب کرنا رب کائنات کے حق میں ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ کیونکہ اس طرح کے کلی اختیارات اسی ہستی برتر کو زیب دیتے ہیں جسکے اشارے پر کائنات کا ذرہ ذرہ گردش کرتا ہے۔ قراء کے اجماع کے پیش نظر اللہ کو مرفوع پڑھا جانا چاہیئے اور اگر کوئی نصب بھی پڑھتا ہے تو اس سے قریب ہی مفہوم سمجھا جائیگا اگرچہ یہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ سے پہلے من ماننا پڑیگا اور پھر اس کا مفہوم ان الفاظ میں ہوگا "من یرید من اللہ ان یھدیہ" اور اس کے بعد اب من کو حذف کرکے پھر نصب پڑھا جائیگا کیونکہ ایسا کرنے میں حرف صلہ کا تکرار ہوگا جیسا کہ کہا جاتا ہے "من تیسر الصوم ما لھم القطیع" اور ایسی تاویل کے چند حروف میں ہی جائز اور درست ہے۔

قرآن پاک کی اس آیت کریمہ "انا جعلناہ قرآنا عربیا" کی تاویل کرتے ہوئے معتزلی حضرات قرآن کو مخلوق مانتے ہیں اسکی دلیل "وما یأتیھم من ذکر من ربھم محدث" سے دیتے ہیں۔ ابن قتیبہ معتزلیوں کے خلق قرآن سے متعلق عقیدہ اور انکے استدلال پر کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جعل" کے دو معنی ہیں ایک معنی تو خلق کے ہیں اور دوسرا غیر خلق کے۔ ...... "اگر جعل متعدی بیک مفعول ہو تو 'خلق' کا معنی و مفہوم ہوگا جیسے 'خلق السموات والارض وجعل الظلمات والنور'۔ یہاں یہ لفظ بمعنی خلق کے مستعمل ہوا ہے اسی طرح 'جعل منھا زوجھا' اور اگر متعدی بدو مفعول ہوگا تو غیر خلق کے معنی دیگا مثلاً "وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا" ای صیرتم' اور اسیطرح

یہ قول: "فجعلناھا نکالا لما بین یدیھا وما خلفھا" اور اسی طرح کسی قائل کا یہ قول "جعل فلان اسرار اولی بھا"۔ ان تشریحات کے ذریعہ ابن قتیبہ انہیں مسکت جواب دیتے ہیں۔

علمائے عظام کے تأثرات قلبی

اگرچہ مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں ابن قتیبہ کا بلند مرتبہ و مقام حامیٔ سنت کی حیثیت سے ذہنوں میں مستحضر ہو جاتا ہے بشرطیکہ عدل و انصاف کے ساتھ اور تعصب کی عینک اتار کر اسکی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا جائے۔ یہاں علماء عظام کے وہ احساسات و خیالات پیش کئے جاتے ہیں جو ابن قتیبہ کی عظمت و برتری پر ناطق شہادتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔

حاکم عبداللہ النیسابوری کہتے ہیں کہ: "ابن قتیبہ کو مختلف علوم و فنون میں تقدم کا شرف حاصل تھا اور وہ وقت کا مقبول ترین امام تھا۔"

حافظ السلفی ابوطاہر احمد بن محمد الاصبہانی کا کہنا ہے کہ: "ابن قتیبہ قابل اعتماد لوگوں میں تھا اور اہل سنت کا حامی تھا۔"

مسلم بن قاسم کہتے ہیں کہ: "ابن قتیبہ لغت کا شہسوار، بہت زیادہ کتابوں کی تالیف کرنے والا فن تصنیف کا ماہر و مشاق اور اہل سنت کا دوست تھا۔"

ابن حزم کہتے ہیں کہ: "ابن قتیبہ اپنے دین اور علم میں ثقہ تھا۔"

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ: "ابن قتیبہ نحوی، لغوی اور صاحب علم تھا۔ اس نے بڑی کارآمد تصنیفات کی ہیں جو علوم نافعہ پر مشتمل ہیں۔ بڑا ہی ثقہ اور قابل عظمت تھا۔"

خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ "وہ بہت ہی ثقہ، دیندار اور فاضل تھا۔ اس کے ہاتھوں بڑی مشہور تصنیفات منظر عام پر آئیں۔"

ابو المعالی (امام الحرمین) کہتے ہیں کہ: "ابن قتیبہ شر و فساد و کذب و بطلان اور ان تمام ہی چیزوں کے خلاف جنگ کرتا تھا جسے وہ غلط سمجھتا تھا۔"

حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ: "ابن قتیبہ کے ذریعہ بہت ساری تصنیفات منظر عام پر آئیں وہ سچا تھا اور کم روایتیں بیان کرتا تھا۔"

ابن الجوزی کہتے ہیں : " ابن قتیبہ ثقہ عالم ، دیندار اور فاضل تھا ۔"

ابوبکر بن درید کہتے ہیں کہ : " مجھ سے ابن قتیبہ کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے کہا : وہ ایک ٹیلہ کی طرح ہیں جو دو پہاڑوں کے درمیان ہو یعنی ثعلب اور مبرد سے بھی ممتاز و نمایاں ۔"

جرجانی کہتے ہیں کہ " ابن قتیبہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو اپنے آپ کو احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ مسلک علمائے اہل سنت کے حامی ہیں ۔"

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ : " یہ حقیقت ہے کہ قرآن وحدیث کے معاملے میں ابن الانباری ابن قتیبہ سے بڑھ کر نہیں اور نہ ہی ابن قتیبہ سے بڑھ کر متبع سنت ہے ۔ اور فن فقہ میں بھی ابن قتیبہ ابن الانباری سے مقدم ہیں ۔"

ابن تیمیہ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ابن قتیبہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اہل سنت کی تائید و حمایت میں وہ ایسا ہی تھا جیسا جاحظ معتزلہ کی حمایت میں پس ابن قتیبہ اہل سنت کا خطیب ہے اور جاحظ معتزلہ کا ۔"

تیسری صدی ہجری کے دور اضطراب میں ابن قتیبہ کا وقت کی ایک پکار ثابت ہونا ، اخلاق حسنہ کے زیور سے آراستہ ہونا ، قرآنی خدمات سے متعلق اپنی توجہات کو دو جہتوں سے مرکوز کرنا ، مشکل القرآن اور غریب القرآن جیسی بلند پایہ تصنیفات کو منظر عام پر لانا ، جہمیہ اور مشبہہ کی رد میں الاختلاف فی اللفظ والرد علی الجہمیۃ والمشبہہ کا شرمندۂ تالیف کرنا نیز علماء عظام اور ممتاز ترین ادبا کے احساسات قلبی کا اظہار ، یہ تمام مباحث ابن قتیبہ کی سرگرمیوں کی ایک خاص جہت د متکلم اسلام کی متعین کرنے کے لئے ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ یہ بات کہ اسکی کچھ دوسری تصنیفات میں کچھ امور و مباحث قابل اعتراض ہیں ، اس سے انکار نہیں ۔ لیکن لغزشوں اور کوتاہیوں کی بنا پر دین و عقیدہ میں شک کرنا اور جہمیہ اور مشبہہ کی طرف منسوب کرنا ، ابن قتیبہ کے ساتھ دیانتدارانہ سلوک نہیں ہے ۔ حق تو یہ ہے کہ نحوس ترین حالات میں ابن قتیبہ کی اہل سنت کی طرف سے نمائندگی کرنا اور پوا زور قلم صرف کر کے مقدس جذبات کو جامۂ عمل پہنانا یہ ایسا کارنامہ ہے جو ابن قتیبہ کو تیسری صدی ہجری کا متکلم اسلام کہنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے ۔

حواشی

۱۵ تفصیلات کیلئے رجوع کریں اثر القرآن فی ... العربی محمد زغلول سلام ، دار المعارف مصر ص ۱۶۲

۱۶ ابن قتیبہ ۔ سعید زغلول ص ۳۴ دار المعارف ، بیروت

۱۷ اثر القرآن فی تطور النقد ص ۱۱۱ — ۱۱۰

۱۸ ابن قتیبہ ۔ سعید زغلول ص ۳۵ دار المعارف ، بیروت

۱۹ تاویل مشکل القرآن ۔ ابن قتیبہ ۔ ص ۷۸ — ۷۷

۲۰-۲۱ سورۃ فصلت ۱۱ — سورۃ ق ۳۰

۲۲ تاویل مشکل القرآن ۔ ابن قتیبہ ۔ ص ۸۲ — ۸۳

۲۳ " " " ص ۸۴

۲۴ " " "

۲۵ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ۔ ج ۱ ۔ ص ۶۳۹ ، لاہور

۲۶ ابن قتیبہ ۔ العالم ، الناقد ، الادیب ۔ عبد الحمید سند الجندی ص ۱۶۱ ۔ دار الثقافۃ والارشاد ، مصر

۲۷ سورۃ الانعام ۱۲۶

۲۸ الاختلاف فی اللفظ والرد علی الجہمیۃ والمشبہہ ابن قتیبہ ص ۱۶ ، مصر ۱۳۴۹ھ

۲۹ " " " " ص ۲۷

۳۰ علماء کے ارشادات " تاویل مشکل القرآن " کے مقدمہ سے ماخوذ ہے ۔

مضمون نگار حضرات مضامین خوش خط اور ورق کے صرف ایک طرف تحریر فرمایا کریں ۔ (ادارہ)

ایک پیغام

بنامِ فرزندانِ فلاح

از: شیخ منصف مبارک پوری

اگر تم پیروِ حق ہو تو تم روشن ستارے ہو
فلک پر ہیں ستارے، تم زمیں پر چاند تارے ہو
نظر آئیں نہ تم سے کیوں رہِ منزل کے پیچ و خم
ظلام راہِ منزل میں، ضیا کے تم منارے ہو
مگر آتا ہے تم کو پیروِ خیر الوریٰ ہونا

جہاں میں علم دیں خود چشمۂ نورِ ہدایت ہے
یہی دنیائے انسانی میں اک پیغام راحت ہے
شرفِ انسانیت کو ہے اسی سے رہتی دنیا تک
اسی سے درحقیقت آدمی میں آدمیت ہے
بجز اس کے نہیں ممکن جہاں میں باخدا ہونا

طلب گارانِ منزل کے لئے روشن نشاں ہو تم
ستاروں کی طرح روئے زمیں پر ضوفشاں ہو تم
ہو تم امیدگاہِ دل، طریقِ زندگانی میں
تمسک ہو جو سنت سے تو میرِ کارواں ہو تم
مگر دین کے بجز ممکن نہیں ہے رہنما ہونا

تمہیں سرو و صنوبر کی طرح تم کو لہکنا ہے
عنادل کی طرح باغِ شریعت میں چہکنا ہے
چمن میں جس طرح سے پھول کھلتے اور مہکتے ہیں
تمہیں بھی پھول کی مانند کھلنا اور مہکنا ہے
خیابانِ چمن میں تم جہاں نکہت فزا ہونا

برائے حق تمہیں دنیا میں جینا اور مرنا ہے
بہر قیمت جہاں میں کلمۂ حق اونچا کرنا ہے
اطاعت ہر قدم پر فرض ہے امرِ شریعت کی
قبائح سے تمہیں بچنا، فضائل سے سنورنا ہے
تدین کے بجز ممکن نہیں ہے باصفا ہونا

رسول اللہ کا ہر حکم بے چون و چرا مانو
جہاں میں جس کو تم مانو فقط بہرِ خدا مانو
جہادِ زندگی میں ہے یہی ایماں کا درجہ
شریعت کو ہی اپنی زندگی کا رہنما مانو
اطاعت کے ہر اک وعدے کا واجب ہے وفا ہونا

رسول اللہ کا اسوہ شرف ہے زندگانی کا
بنا ہے بامِ عزت ہے، نشاں ہے کامرانی کا
منظم ہے صفِ باطل جوانانِ حرم اٹھو
بھلا اس سے بھی ہو سکتا ہے کیا مصرف جوانی کا
ہے صد تقریر سے بہتر ایک تاثیرِ ادا ہونا

تمہاری وضع ایمانی روایت سے مزین ہو
تمہاری زندگی خورشیدِ اسلامی سے روشن ہو
تمہارا ہر قدم پابند ہو حکمِ شریعت کا
تمہارا فکر و فن، قرآن و سنت سے مبرہن ہو
تو بابرکت ہے دنیا میں تمہارا مقتدا ہونا

تمہیں گر اسوۂ سردارِ عالم سے رہی دوری
تو عزت ہو نہیں سکتی ہے خاقانی و فغفوری
تشبہ ان سے نیکی اور سعادت ہے بہرصورت
مخالف ہیں ہے گمراہی، مخالف گرچہ ہو صوری
کہ واجب ہے مسلمانی میں تسلیم و رضا ہونا

ستیزہ گاہ کفر و دیں میں اب نوبت تمہاری ہے
یہ بزمِ حق و باطل ہے، یہاں ہر ضرب کاری ہے
شبِ تاریک، گرداب بلا، امواجِ طوفانی
تمہاری ناخدائی کی اب اس عالم میں باری ہے
مگر آساں نہیں ایسے میں ہرگز ناخدا ہونا

بھروسا قادرِ مطلق کی قدرت پر کرو دل سے
رہائی دیتا ہے بندوں کو جو زندانِ مشکل سے
ہر اک مشکل میں شایاں ہے صبر و عزیمت شانِ ایمانی
جہادِ زندگی میں زندگی ہے تیغ و قاتل سے
تمہیں مشکل ہے کیوں پھر مردِ میدانِ وفا ہونا

ضرورت حق کی جاں مانگے، سعادت جان کر دیدو
جہادِ حق میں جاں اپنی عبادت جان کر دے دو
امانت ہی جہاں میں ہم فقط اللہ کی منصف
امانت جب امیں مانگے، امانت جان کر دے دو
مگر باایماں باقی رہے گا حق ادا ہونا

جاوید اشرف فلاحی

رپورٹ اجلاسِ شوریٰ انجمنِ طلبۂ قدیم، جامعۃ الفلاح

منعقدہ ۹، ۱۰، ۱۱؍ جون ۱۹۸۸ء

ایجنڈے کے مطابق کارروائی کا آغاز ۹؍ جون ۱۹۸۸ء کو بعد نمازِ مغرب صدرِ انجمن کی صدارت میں مولانا رحمت الاثری صاحب کی تذکیر سے شروع ہوا۔

تذکیر کے بعد برادر شمیر صاحب فلاحی کی والدہ ماجدہ کے انتقال پر انجمنِ طلبۂ قدیم کی مجلسِ شوریٰ نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار اور مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت کی۔ اللہ تعالیٰ برادر شمیر صاحب فلاحی کو یہ غم برداشت کرنے اور صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ارکانِ شوریٰ کو یہ معلوم کرکے بے حد افسوس ہوا کہ شہر اعظم گڑھ کے محترم عبد العزیز خاں (راجو خاں صاحب) بمبئی میں طویل علالت کے بعد ۷؍ جون ۱۹۸۸ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم جامعہ کے قدیم سرپرستوں میں سے ایک تھے۔ افسوس کہ جامعہ اپنے ایک مخلص ہمدرد سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔ آپ ہمیشہ جامعہ کی دامے درمے خدمت انجام دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کی خدمات کو قبول کرے، نیز ان کے جملہ متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس کے بعد سابقہ کارروائی کی خواندگی ہوئی اور جائزہ لیا گیا۔ چند طے شدہ قابلِ ذکر امور درج ذیل ہیں:

۱۔ وظائف (تعلیمی قرض) مشروط اور محدود ہوں گے جو دفترِ انجمن سے دیئے جائیں گے۔ نیز علیگڑھ اور جامعہ ملیہ میں موجود طلبہ کے علاوہ جامعہ میں زیرِ تعلیم طلبہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے۔

۲۔ "حیاتِ نو" کی توسیع و اشاعت کے سلسلے میں یہ طے ہوا کہ سردست انجمن کے دو نمائندے ملک کے مختلف علاقے کا دورہ کریں گے، خریدار بنائیں گے اور اشتہارات حاصل کریں گے۔

۳۔ کینٹین کے نظم و انتظام کو مزید بہتر بنانے کے لئے ایک جزوقتی کارکن کی خدمات حاصل

باقی صفحہ ۱۳ پر

پہلی قسط

سید قطب شہیدؒ کی قرآنی خدمات

عبید اللہ فہد، ریسرچ اسکالر، شعبۂ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عصرِ جدید میں قرآن کریم کی ادبی تفسیر کا جو رجحان ابھرا ہے اس کے سرخیل محمد عبدہ مرحوم قرار دیئے جا سکتے ہیں اور اس طبقے کے نمایاں مفسرین میں شیخ رشید رضا، شیخ محمد مصطفیٰ مراغی اور سید قطب شہید شامل کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کا ممتاز ادبی قدر کا کام مصر میں زیادہ ہوا ہے جس میں یہ فکر کارفرما تھی کہ قرآن کو اپنے دور کے دل و دماغ میں اسی طرح جدید پیرایہ میں پیش کیا جائے جس طرح اہلِ عرب نے اسے پہلی بار پایا تھا۔ منکر و مومن سب اس کی جودتِ بیان سے متاثر و مرعوب تھے۔ منکرین اس کی سحر انگیزی سے متاثر ہوئے تو ان کی وحشت و نفرت میں اور اضافہ ہو گیا اور اہلِ ایمان اس سے مسحور ہوئے تو ان کی فرماں برداری اور ایمان و یقین کی دولت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ یہ ادبی گروہ اس بات کا قائل تھا کہ قرآن کے حسن و جمال اور اس کے بیان و زبان کی روح پرور تازگی کو عوام کے سامنے لانا ضروری ہے۔ اس کے لئے لغوی، نحوی اور فقہی و کلامی موشگافیوں کو الگ رکھ کر اس کی فنی اور ادبی خصوصیات کو نمایاں طور پر پیش کرنا لازم ہے تاکہ انسانی حواس قرآن کے واضح و روشن الفاظ اور اس کے لطیف ادبی حسن و جمال سے روشناس ہو سکیں۔ دور از کار تاویلات، مذہبی و لغوی بحثوں، علمی و تحقیقی کاوشوں سے مخاطب کو مرعوب کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے دل کی دنیا فتح نہیں ہو سکتی اور ہدایت و رحمت کے دروازے اس پر کھل نہیں سکتے۔ عام طور پر اہلِ تفسیر نے اپنی موشگافیوں اور نکتہ آفرینیوں سے قرآن کو پیچیدہ بنا کر عام آدمیوں کے لئے ناقابلِ قبول بنا دیا ہے۔ ان کی تفسیریں پڑھ کر قاری کے احساس و شعور میں کوئی گہرائی اور اس کے قلب و ضمیر میں اصلاحِ احوال کی کوئی زبردست تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ امام رازی کے بارے میں مولانا ابو الکلام آزاد کا یہ تبصرہ قابلِ غور ہے کہ "انھوں نے قرآن کے سراپا کو مصنوعی لباس و وضعیت سے آراستہ کرنے کی پوری کوشش کی" اور یہ کہ "انھوں نے شکوک و شبہات کے دروازے کھولنے میں بڑی تیزی دکھائی لیکن انھیں بند کرنے میں تیزی نہ دکھا سکے"۔

سید قطب کی تفسیری خدمات پر گفتگو کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس طبقہ کے دوسرے ترجمان مفسرین کے کارناموں کا جائزہ نہ لیا جائے اور ان کے محاسن و معائب پر تنقیدی نگاہ نہ ڈالی جائے۔ لیکن اس طبقہ اور رجحان تفسیر کی نمایاں خصوصیات اتنی زیادہ ہیں کہ خامیوں پر شاید پردہ پڑ جاتا ہے۔ اس مکتب فکر نے کسی مسلک یا نظریہ کے حصار میں محصور ہونے کے بجائے قرآن کے ادبی طرز تعبیر کی وکالت کی ہے۔ اس سے پہلے کی بیشتر تفسیریں کسی مکتب فکر کی ترجمان سمجھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر جصاص نے قرآن کا مطالعہ اس طرح کیا کہ وہ فقہ کی الکتاب نظر آنے لگا۔ زمخشری نے مسلک معتزلہ کی ترویج و اشاعت کے لئے الکشاف لکھی۔ متکلمین قرآن کو خالص کلامی مباحث کا ماخذ سمجھ کر منطقیانہ بحثوں میں الجھ کر رہ گئے۔ محمد بن احمد بن محمد تبریزی تھانیری نے کاشف الحقائق و قاموس الدقائق طریقت و حقیقت کی باریکیوں کو سمجھانے کے لئے لکھی۔ بریلوی مکتب فکر نے قرآن پاک کو لغت بریلوی کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا۔ شیخ حاجی عبدالوہاب تیجاری نے قرآن پاک کی جو تفسیر لکھی، اس میں مطالب قرآنی کو مناقب نبوی کا رنگ دے دیا اور اس میں رقائق اسرار و محبت بیان کئے۔ غرضیکہ بیشتر تفسیریں کسی مخصوص طرز فکر اور مسلک کی ترجمان ہیں۔ اس طبقہ نے اس طرح کی نظریاتی بندش سے آزاد ہو کر یہ کام کیا۔

اس مکتب فکر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اسرائیلیات کو نقد و جرح کی کسوٹی پر پرکھا۔ رطب و یابس ہر طرح کی روایات سے اپنی تفسیر کو بھرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس سے قرآن کا حسن و جمال متاثر ہو رہا تھا۔ اسی طرح کمزور اور موضوع احادیث کو اس مکتب نے در خور اعتنا نہ سمجھا اور قرآن پاک کی تفسیر میں صحیح احادیث پر اعتماد کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کے مبہم آیات، غیبی امور و معاملات پر رائے زنی نہ کی بلکہ صحیح شرعی نصوص پر یقین رکھتے ہوئے ان مسائل سے تعرض نہ کیا جن کا تعلق متشابہات سے تھا۔ تفصیلات و جزئیات پر گرم بازاری کو اپنا شیوہ نہ بنایا۔ اسی طرح ان لوگوں نے علوم و فنون کی رائج اصطلاحات و تعبیرات کو قبول نہ کیا اور اپنی تفسیروں میں ان کے عمل دخل کو پسند نہ کیا جن سے قدیم تفاسیر گراں بار ہو چکی ہیں۔ اس مکتب نے قرآن کے ادبی و اجتماعی اسلوب کو اختیار کیا، قرآن کے ایجاز و اعجاز کو منکشف کیا۔ قرآن کے کائناتی اصولوں اور معاشرتی آداب و قواعد کی وضاحت کی اور قرآن کی رہنمائی کی

روشنی میں امت مسلمہ بلکہ اقوام عالم کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی، سائنس و قرآن کے درمیان توافق ڈھونڈا۔ اور خالق و مخلوق میں ہم آہنگی اور وحدت کا نظر تلاش کیا اور اس حقیقت کو دنیا سے منوایا کہ قرآن پاک ہر زمانہ اور ہر علاقے کے لئے قابل عمل ہے اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالا ہو کر پوری کائنات کی ہدایت و روشنی کا ذریعہ ہے۔

البتہ بعض پہلو ایسے ہیں جو اس مکتب فکر کے حاملین کے یہاں کھٹکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جرح عقل کو لگام نہیں ہے۔ قرآن کے شرعی حقائق کی تاویل و تشریح میں حقیقت کے بجائے مجاز یا تمثیل کا رنگ ان پر غالب ہے اور اس کی وجہ سے بعض صحیح احادیث کو انھوں نے لائق اعتنا نہ سمجھا اور اجماع کے باوجود ان کی طرف توجہ نہیں کی لیکن بحیثیت مجموعی اس طرز تفسیر نے قرآن کے نزول کے مقاصد کی تفہیم میں بہت مدد کی اور ہدایت و رہنمائی کے دروازے ہر خاص و عام پر کھلنے لگے اور اسلام ایک زندہ و توانا نظام کی حیثیت سے دنیا کے آگے آگیا۔

استاذ عبدہ کا طرز تفسیر

استاذ محمد عبدہ کی تفسیری خدمات میں ان پارۂ عم کا تفسیری کارنامہ، سورۂ عصر کی طویل تفسیر، بعض مشکلات قرآن کے مطالعے متعلق تفسیری مباحث، ازہر میں دیئے گئے تفسیری دروس و خطبات شامل کئے جا سکتے ہیں یہ تحقیقات وقت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن ان کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ انہی اشارات و افادات کی بنیاد پر اس ادبی فکر کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

محمد عبدہ وہ پہلے عالم دین ہیں جنھوں نے ازہری علما سے ہٹ کر سب سے پہلے جدید انداز میں دین کی دعوت دینے کی کوشش کی، تقلیدی بندھنوں سے آزادی، جمود و جمود کی بیڑیوں سے نجات پانا جن کا مقصود تھا۔ متقدمین کے تعمیر شدہ مکان کی لیپ پوت کرنے کے بجائے تقلید سے ہٹ کر تحقیق کی نئی شاہراہ نکالی۔ اس کے لئے اسلاف کی فکر سے اختلاف بھی کیا۔ سابقین کی بنائی ہوئی راہ سے انحراف اور بزرگوں کے نقش قدم سے اعراض کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ چونکہ ان تحقیقات کی زد بہتوں پر پڑی اور بہت سے حلقے ان تحریروں کی زد میں آئے اس لئے مخالفت بھی خوب ہوئی اور عقیدت کا بھی خوب اظہار ہوا۔ یہ آزادروی اور وسیع المشربی تفسیر میں بھی نمایاں ہے۔ وہ قرآن کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جس سے نزول قرآن کا مقصد حاصل ہو سکے یعنی ارشاد و توجیہ

قرآنی تفسیر کا اولین ہدف ہونا چاہیے اور دوسرے مسائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔[۳۵] امام عبدہ ان مفسرین پر تبصرہ و تنقید کرتے نظر آتے ہیں جنھوں نے شاذ و توجیہ کے بجائے تحقیقی فنکاری کو اپنی تفسیر کا مقصود بنایا اور معانی و بلاغت، نحو و صرف، فقہی اختلافات وغیرہ کے حصار میں محصور ہے اور کتاب الٰہی کے مقصود اصلی سے، اعراض اور اس کے حقیقی مفہوم سے ناآشنائی کا سبب بنے۔[۳۶]

امام عبدہ کے نزدیک تفسیریں دو قسم کی ہیں:

خشک، جامد اور کتاب الٰہی سے دور کرنے والی تفاسیر جن کا مقصد حل الفاظ، اعراب و ترکیب کی تعیین اور فنی اشارات و نکات کی توضیح سے زیادہ نہیں ہوتا۔ استاذ کے خیال میں انھیں تفسیر کہنا درست نہیں ہے بلکہ یہ نحو و معانی کی تجربہ گاہیں ہیں۔

دوسری قسم کی تفسیریں وہ ہیں جن میں کلام الٰہی کی تفہیم و تشریح، احکام و شرائع کی حکمتوں کی توضیح اس طرح کی جاتی ہے کہ قلب و روح کھنچنے لگیں، دل و دماغ پر سحر طاری ہونے لگے اور ہدایت و رہنمائی کے دروازے کھلنے لگیں۔ یہ وہ مقصد ہے جس کی خاطر قرآن نازل ہوا تھا اور یہی مقصد اولین تفسیر نویسی کا ہونا چاہیے۔[۳۷]

استاذ امام کے نزدیک عقائد و نظریات کا منبع و ماخذ قرآن ہونا چاہیے۔ قرآن ہی وہ معیار اور کسوٹی ہے جس پر نظریات و افکار کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ اگر ہم پہلے سے کوئی فکر یا عقیدہ لے کر قرآن کا مطالعہ کریں گے تو ہدایت کے بجائے ضلالت ہمارے حصہ میں آئے گی، اور کتاب الٰہی ہمارے حق میں نہیں بلکہ ہمارے خلاف حجت ثابت ہوگی۔ اس لئے استاذ کے الفاظ میں قرآن جیسے اصل ہے جس پر دینی آراء و افکار کی پیمائش ہوگی نہ یہ کہ قرآن کو مذاہب کی میزان پر رکھا جائے اور تحریف و تاویل کا راستہ کھولا جائے جیسا کہ بدنام فرقوں اور گمراہ جماعتوں کا وطیرہ رہا ہے۔[۳۸]

مبہمات و متشابہات کے سلسلہ میں امام کا عقیدہ تھا کہ قرآن نے نص قطعی کے ذریعہ جو کچھ واضح کر دیا ہے، اس پر ایمان رکھا جائے اور قیل و قال میں پڑنے کے بجائے غیب پر ایمان لایا جائے اور جزئیات و تفصیلات کی ٹوہ میں نہ پڑا جائے۔ مثال کے طور پر سورۂ انفطار کی آیات - ۱۱ پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیب کی جن چیزوں پر ایمان لانا ہمارے لئے واجب ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہم پر کچھ نگراں مقرر ہیں جو ہماری نیکیاں اور برائیاں لکھتے جاتے ہیں۔ ہمارے لئے

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان نگرانوں کی حقیقت و ماہیت کا پتہ لگائیں کہ ان کی تخلیق کس چیز سے ہوئی اور ان کی لکھائی اور نگرانی کرنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟ کیا ان کے پاس اسی طرح ورق، قلم اور سیاہی ہوتی ہے جو ہمارے یہاں معروف اور رائج ہے؟ جب کہ یہ بعید از فہم ہے یا ان کے پاس تختیاں ہیں جن پر اعمال رقم ہوتے ہیں؟ کیا ان کے حروف اور شکلیں وہی ہوتی ہیں جن سے ہم مانوس ہیں؟ یا وہ ایسی روحیں ہیں جن پر اعمال واضح ہو جاتے ہیں اور کاغذ پر روشنائی کی طرح وہ اعمال ثبت ہو جاتے ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے؟ ان چیزوں کو جاننے کے ہم مکلف نہیں ہیں۔ ہماری ذمہ داری تو بس غیبی خبر پر ایمان لانے کی ہے اور حقیقی معانی تو اللہ کے حوالے ہیں۔ ہمارے اعمال کے سلسلے میں جس چیز پر ایمان لانا واجب ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اعمال گنے جاتے اور محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ ان میں ایک ذرہ یا نقطہ کی کمی نہیں ہوتی۔[۳۹]

امام کی خوبی یہ ہے کہ جس آیت سے بھی گزرتے ہیں اس سے اقوام عالم کے سیاسی و معاشرتی امراض کے لئے کوئی نسخۂ کیمیا تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح جدید علم کی تجربات و انکشافات ہیں ان سے بھی ناواقف نہیں ہیں بلکہ ان میں اور قرآن میں تطابق کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں لیکن اس کوشش میں بسا اوقات ٹھوکر بھی کھا جاتے ہیں اور کہیں کہیں اجماع یا تفسیر کے عام راستے سے بغاوت بھی کر جاتے ہیں۔[۴۰] اسی طرح ملائکہ، جن، ابلیس وغیرہ اور ایسے مسائل سے تعرض کرتے ہوئے صحیح احادیث کو بھی پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

علامہ رشید رضا کا طریقۂ تفسیر

سید جمال الدین افغانی اور استاذ محمد عبدہ کے جانشین اول اور حقیقی وارث علامہ رشید رضا ہیں جنھوں نے محمد عبدہ کی حیات میں ان کے خطبات و دروس سے سب سے زیادہ استفادہ کیا اور ان کی زندگی میں ترتیب و تنقیح کی اور استاذ کی تصحیح کے بعد شائع بھی کر دیئے۔ علامہ رشید رضا دراصل استاذ عبدہ کے طرز تفسیر کے پیرو اور انہی کے مکتب کے شاگرد تھے۔ ان کے منہج و مبدء سے انحراف و اعراض گوارا نہ کیا۔ چنانچہ عبدہ کہا کرتے تھے کہ صاحب المنار ہی میرے افکار کے ترجمان ہیں۔[۴۱]

رشید رضا نے قرآن پاک کی مشہور تفسیر لکھی جو تفسیر المنار کے نام سے معروف ہے۔

ابھی سورۂ یوسف آیت ۱۰۱ تک پہنچے تھے کہ قضا نے مہلت نہ دی اور وہ بارہ جلدوں میں ناتمام تفسیر چھوڑ کر اپنے رب سے جا ملے۔ بارھویں جلد سورۂ یوسف آیت ۵۳ تک ہی شامل ہے۔ بعد میں استاذ بہجت بیطار نے بقیہ حصے مکمل کر کے سورۂ یوسف کی الگ تفسیر رشید رضا کے نام سے چھپوا دی۔ اس کے علاوہ سورۂ کوثر، کافرون، اخلاص اور معوذتین کی تفسیر بھی لکھی جس میں استاذ عبدہ کی روح پوری طرح جلوہ گر ہے۔ بہت معمولی سا فرق کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔

علامہ کا مقصد تفسیر بھی محض قرآن کی ہدایت و رحمت کو عام کرنا ہے۔ انھوں نے ان مفسرین پر شدید تنقید کی ہے جنھوں نے علوم و فنون کے قواعد، موضوع احادیث، اسرائیلی خرافات وغیرہ سے اپنی تفسیروں کو ضخیم بنا دیا ہے اور جس سے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس تفسیر سے مرا مقصد قرآن کے معنی کی وضاحت اور امور لاتے ہیں اس سے ہدایت کے راستوں کی توضیح ہے۔

علامہ اپنے استاذ کے طرز تفسیر سے انحراف نہیں کرتے۔ مفسرین کے اقوال کے پابند نہیں ہیں۔ نص قرآن کو عقیدہ کے حق میں استعمال نہیں کرتے بلکہ عقیدہ کا استخراج خود قرآن سے کرتے نظر آتے ہیں۔ اسرائیلیات سے تعرض نہیں کرتے۔ مبہمات و متشابہات کی تعیین میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ دقیق و علمی بحثوں سے دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ آیات کی تشریح بلیغ و دلکش اسلوب میں کرتے ہیں۔ آسان اور مانوس الفاظ اور جملوں کے ذریعہ معانی کی توضیح کرتے ہیں۔ اور شکوک و شبہات کا اس طرح ازالہ اور قرآن کا اس طرح دفاع کرتے ہیں کہ قرآن کا مقصد نزول پورا ہوتا نظر آتا ہے اور کتاب الٰہی امراض انسانی کے لئے نسخۂ کیمیا ثابت ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

لیکن استاذ کا سایہ سر سے اٹھتے ہی ان کے طرز تفسیر سے کسی قدر انحراف کرتے نظر آتے ہیں اور اپنی راہ خود متعین کرتے ہیں۔ اب وہ سنت صحیحہ کا التزام کرتے ہیں اور صحیح احادیث کی روشنی ہی میں تفسیر کرتے ہیں۔ بعض مفردات یا لغوی جملوں اور علماء کے درمیان اختلافی مسائل میں انھوں نے استاذ سے کافی اختلاف کیا۔ مختلف سورتوں سے تائیدی اور شہادتی آیات کثرت سے پیش کیں، جن مسائل میں مسلمانوں کو تحقیق و تدقیق کی ضرورت تھی ان پر

مباحثے کئے۔ کفار و ملحدین کے خلاف دلائل دیئے اور مسلمانوں کے سیاسی و اجتماعی مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

علامہ کی تفسیر قرآن میں استاذ گرامی کی طرح عقل و فہم کی کافی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ علم کا مضبوط اعتماد اور ارادہ کا استحکام جلوہ نما نظر آتا ہے۔ اسی طرح علماء کے نزدیک جو چیزیں مسلم تھیں ان کی پابندی سے کسی قدر آزاد نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایسی تفسیریں بھی آپ کی جانب سے سامنے آئیں جو غریب و نادر ہونے کے ساتھ اجماع کے خلاف تھیں۔ ان میں کچھ استاذ عبدہ کی پیروی میں تھیں اور کچھ کے بارے میں ان کا اپنا آزادانہ فکر تھا۔ چنانچہ گناہ کبیرہ کے مرتکب مسلمان کو مخلد فی النار قرار دے کر علمائے سنت کی مخالفت کی۔ قصۂ آدم و ابلیس میں اپنے استاذ کے موقف کو باقی رکھا یعنی یہ مکالمہ ملائکہ، بشر اور ابلیس کی صفات کا بیان ہے اور سجدہ کا حکم محض تکوینی امر تھا۔ موصوف قرآن کے بعض الفاظ کو ظاہری مفہوم سے نکال کر مجاز اور تمثیل کا رنگ دے دیتے ہیں۔ جیسا کہ زمخشری وغیرہ معتزلی مفسرین نے قرآن کے اعلان کردہ حقائق سے فرار اختیار کرنے کے لئے کیا۔ جادو کے بارے میں موصوف کا خیال تھا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ ایک قسم کی دھوکہ بازی اور مکاری ہے۔ شیطان اور جنت کے بارے میں بھی موصوف کا نقطۂ نظر علمائے سنت سے ہٹ کر تھا۔ اسی طرح قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کو نبی کریم کا معجزہ نہیں مانتے۔ فقہ کے مسائل میں بھی جمہور علماء کو بسا اوقات نظرانداز کر دیتے ہیں اور اپنی منفرد و شاذ رائے رکھتے ہیں۔ قانون وراثت اور تیمم کے مسائل میں ان کے افکار مشہور ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قدیم مفسرین نے کہیں ٹھوکر کھائی ہے تو استاذ رشید نے ان کو معاف نہیں کیا ہے خاص طور سے فخر الدین رازی کو ہرگز قابل معافی نہیں سمجھتے۔ سورۂ ہود کی آیت ۱۰۳ کی تعبیر میں زمخشری وغیرہ مفسرین کا استاذ نے جو تعاقب کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بدعات و خرافات اور غلط رسم و رواج پر استاذ نے تیر و نشتر چلائے ہیں اور ان کی روحانیت سے نقاب اٹھا دیا ہے۔

لیکن یہ بات ہمیشہ تاریخ کے صفحات میں رقم رہے گی کہ علامہ رشید رضا نے اسلام اور قرآن کا زبردست دفاع کیا۔ شکوک و شبہات پر جارحانہ حملے کئے اور غلط افکار و نظریات کو شکست

چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ امت مسلمہ کے سیاسی، معاشی اور عمرانیاتی مسائل پر خوب لکھا اور قرآن کی روشنی میں ان کا حل ڈھونڈنے کی سعی کی۔ اس راہ میں اپنا قلم، اپنی صحافت، اپنی زبان اور اپنی تقریر سب کو استعمال کیا اور ظلمتوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔

شیخ احمد مصطفیٰ مراغی کا تفسیری منہج

استاذ محمد عبدہ کی مجلسوں سے کم فیض اٹھانے کے باوجود شیخ اکبر نے سب سے زیادہ ان کی فکر عام کی اور دین اسلام کی مدافعت اور قرآن کی تبلیغ و اشاعت میں سب سے زیادہ مثبت اور راست کردار شیخ احمد مصطفیٰ مراغی نے ہی انجام دیا کیونکہ دینی لحاظ سے شیخ کا مرتبہ مسلم تھا اور طرز تفسیر بھی سنجیدہ اور ایجابی تھا۔

شیخ کے یہ دروس تفسیر قرآن کی شکل میں شائع ہو کر خاص و عام کی ہدایت کا سبب بن چکے ہیں۔ یہ دروس شیخ نے قاہرہ کی مختلف مسجدوں اور علمی مجلسوں میں دیے تھے جو افادۂ عام کی خاطر شائع کر دیے گئے۔ ان درسوں میں قرآن کی تفہیم سادہ اور واضح انداز میں کی جاتی تھی۔ درس کے لئے ان آیات کا بطور خاص اہتمام کرتے تھے جن میں اللہ کی قدرت کے دلائل اور اس کی عظمت کی نشانیوں پر گفتگو ہوتی تھی کہ اس سے ہدایت کے ذرائع آسانی سے مہیا ہوتے تھے اور عبرت و نصیحت کے مواقع زیادہ ملتے تھے۔ ان آیات کا انتخاب بھی کرتے تھے جن کا جدید علوم سے کوئی تعلق ہوتا تھا تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ قرآن علم کی ترقی میں حائل نہیں ہے نہ سائنس کے صحیح اصولوں اور درست نظریات کا منکر ہے۔ اس طرح قرآن اور جدید سائنس کے درمیان تطابق کی معتدل و متوازن کوشش بھی علامہ کے حصہ میں آئی۔

شیخ کا طریقۂ درس یہ تھا کہ پہلے تمام مفسرین کی تفسیروں کو کھنگالتے۔ ان کے جواہر ریزوں کو سمیٹتے اور اگر ان سے تسلی ہو جاتی تو انہی کی رایوں کو تسلیم کر لیتے۔ انھوں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ کوئی نئی تحقیق کی ہے جس سے قدماء کی نظر چوک گئی تھی بلکہ اس کے برعکس ہمیشہ اس امر کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ مفسرین کی کوششیں قابل قدر اور قیمتی ہیں اور ان کی مساعی محمود و مشکور ہیں۔ ان کی یہ تفسیر تو اسلاف ہی کی خوشہ چینی اور انہیں سے استفادہ ہے[۱۹] اپنے پیش رووں کی طرح شیخ نے مفسرین پر اعتراض اور تنقید نہیں کی ہے نہ ان کے کارناموں پر تنقیص و تدقیق کی نظر ڈالی ہے

بلکہ کہیں جائزہ اور تجزیہ کی ضرورت محسوس کی ہے تو بڑی احتیاط سے اور سلجھے ہوئے انداز میں، صاف ستھری عبارت اور شائستہ اسلوب میں اور علماء و فضلاء کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ جسارت کی ہے۔

اسی طرح قرآن کی مبہم و متشابہ آیات میں عقل کے گھوڑے نہیں دوڑائے ہیں۔ نہ ان تفصیلات و جزئیات میں دخل اندازی کی کوشش کی ہے جن کے بارے میں قرآن خاموش ہے اور رسول اللہ نے جس سے پہلو تہی کی ہے۔ ضعیف اور موضوع روایات سے تفاسیر کو بھرنے کی روایت بھی یہاں نہیں ملتی، نہ اسرائیلیات سے کسی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ الخ کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "۔۔۔ ہم نہیں جانتے کہ سابق امتوں پر اللہ نے کیا چیز فرض کی تھی؟ کیا وہ رمضان کا مہینہ تھا؟ جیسا کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے یا کوئی اور مہینہ تھا؟ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے کوئی اطمینان بخش بات کہی جا سکے اور تشبیہ کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر چیز میں مشابہت ہوگی۔ ہمارا بس یہ ایمان ہے کہ سابق قوموں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے لیکن ان کی مقدار اور کیفیت ہم نہیں جانتے۔ مختلف قوموں میں روزہ مختلف شکلوں میں معروف اور رائج رہا ہے"[۲۰]

شیخ قرآن پاک کی تفہیم کے وقت احکام و شرائع کی حکمتوں اور مصالح سے بھی بحث کرتے ہیں تاکہ اسلام پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو اور احکام و شرائع کی پیروی آدمی صدق دل سے کرے۔ جبر و اکراہ کا ماحول نہ ہو بلکہ برضا و رغبت اطاعت کی جائے۔ چنانچہ روزہ کی حکمت اور فوائد اس طرح بیان کرتے ہیں: "روزہ ان پانچ ارکان میں سے ہے جن پر اسلام کی عمارت کھڑی ہے۔ جسمانی ورزش ہے، تعمیر اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے، روحانیت کی تطہیر ہوتی ہے کیونکہ شہوتوں کی باعث اور لذتوں میں انہماک روح اور قدسی کمالات اور الٰہی فیضان کے درمیان حجاب ہے جو الہامی تجلیات کو قبول کرنے سے روکتا اور خدا سے رشتہ استوار کرنے میں حائل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین و سالکین جب بھی ذات خداوندی سے دوری محسوس کرتے ہیں روزہ کی طرف لپکتے ہیں تاکہ براہ راست وصل کا مزہ چکھ سکیں"[۲۱]

"لذتوں سے محرومی اور شہوتوں سے مایوسی پر ڈٹے رہنے سے ارادہ کی تربیت ہوتی ہے اور عزم بالجزم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے باوجود نقض عہد سے اجتناب کی عادت پڑتی ہے۔ جب قوت ارادی کی اس طرح تربیت ہو جاتی ہے تو شرعی ذمہ داریوں کو آدمی سکون اور آمادگی سے انجام دیتا ہے۔ خوف خدا اور مراقبہ کا تصور جاگزیں ہوتا ہے اور حیا و توکل کا جذبہ بڑھ جاتا ہے اور اسی میں تمام بھلائی ہے، اسی سے تقویٰ کا حصول ہوتا ہے نفس کے اندر ایثار و قربانی کی اسپرٹ اسی سے پیدا ہوتی ہے اور بہادروں اور بزدلوں میں تفریق کے وقت روزہ دار پہلی صف میں کھڑا ہوتا ہے۔" [22]

"یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز ممکن ہے۔ آج فاقہ مستی ہے تو کل غنا بھی آ سکتی ہے، مرض کے بعد تندرستی بھی آتی ہے، عزت کے بعد ذلت سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ گھر میں رہنے کے بعد بے گھر ہونے کی نوبت بھی آ جاتی ہے اور فتح و کامرانی کے بعد شکست و ہزیمت کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ ایسے حادثات لذت کوش انسانوں اور ناز و نعمت میں پلے آدمیوں کو پیش آتے ہیں تو وہ زندگی سے مایوس ہو کر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں ان پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے اور مایوسی سے وہ پیچھا نہیں چھڑا پاتے۔"

"اس لیے اس حکیم و علیم ذات نے ایک ایسی عبادت فرض کی جو جسموں کی ورزش بھی کرے اور اخلاق کی تہذیب بھی اور روح کا تزکیہ اور اس کی تطہیر بھی کرے۔ یہ عبادت روزہ ہے۔" [23]

سید قطبؒ نے قرآن کی دنیا میں قدم کیسے رکھا؟

بچپن کی زندگی، خاندانی ماحول اور گھرانے کی فضا آدمی کے مزاج، اس کی سیرت اور کردار پر انمٹ نقوش ثبت کرتی ہے۔ سید قطب نے تفسیر کی دنیا میں جو خدمات انجام دیں ان کا جائزہ لینے سے پہلے ان کے گھریلو ماحول اور والدین کے طریقۂ تربیت پر گفتگو ضروری ہے کیونکہ یہیں سے قرآن کی تلاوت اور حفظ کا شوق سید کے ذہن میں پیدا ہوا اور بچپن کی ترتیل قرآن کی اور کی صحبتیں رفتہ رفتہ ذہن کی تعمیر اور سیرت کی تشکیل میں کام کرتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید قطب کی پہلی تصنیف بازار میں آئی تو اس کا انتساب اپنی والدہ کے نام اس طرح کیا:

"والدہ محترمہ! میں یہ تصنیف آپ کی نذر کرتا ہوں۔ پیاری امی! مجھے یاد ہے کہ آپ پس پردہ گھنٹوں کان لگائے رہتی تھیں جب رمضان المبارک کے مہینے میں ہمارے گھر پر قاری حضرات نہایت دل نشین انداز میں قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ میں جب بچوں کی مانند شور و غل مچاتا تو آپ مجھے اشارۃً کنایوں میں چپ رہنے کی تلقین کرتیں اور پھر میں بھی آپ کے ساتھ قرآن سننے میں شریک ہو جاتا۔ میں اگرچہ اس وقت مفہوم و معنی سے ناواقف تھا مگر میرا دل الفاظ کے اعجاز و تاثیر سے محظوظ اور موسیقی و ترنم سے مسحور ہوتا تھا۔" [24]

قرآن سے عقیدت و محبت پیدا کرنے کا دوسرا محرک پرائمری اسکول کے اساتذہ تھے جو سرکاری طور پر گاؤں میں بچوں کو مکتب کی تعلیم دیتے تھے لیکن قرآن سے شیفتگی بھی پیدا کرتے تھے۔ سید قطب کو قرآن کی ناظرہ تعلیم اور حفظ میں مدد انہی اساتذہ نے دی۔ اس کا اظہار سید شہید نے اپنے اسی انتساب میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "پھر جب آپ کے سامنے میں پروان چڑھا تو آپ نے مجھے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا۔ آپ کی اولین آرزو تھی کہ اللہ میرے سینے کو کھول دے اور میں قرآن حفظ کر لوں اور اللہ مجھے خوش الحانی کی نعمت سے نوازے اور پھر میں آپ کے سامنے بیٹھا ہر وقت تلاوت کیا کروں۔ جب آپ کی یہ آرزو پوری ہوئی اور میں نے قرآن کریم حفظ کر لیا تو آپ نے مجھے ... اب کا منتظر ہوں۔ میری امی! گو آپ ہم سے رخصت ہو گئی ہیں مگر اب تک آپ کی آخری تصویر ذہن میں ثبت ہے۔ گھر میں آپ کا ریڈیو کے سامنے بیٹھ کر خوش الحان قاری کی تلاوت سننا مجھے اب تک نہیں بھولا۔ تلاوت سنتے وقت آپ کے مقدس چہرے کا اتار چڑھاؤ بھی مجھے یاد ہے جو اس بات کی دلیل تھی کہ آپ کا قلب و دماغ قرآن کے مرور معانی کو بخوبی سمجھتے ہوئے متاثر ہو رہا ہے۔ پیاری امی! آپ کا وہی معصوم بچہ آج جوان سال فرزند ارجمند کی حیثیت سے آپ کی ہی تعلیم و تربیت کا ثمر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ اگر حسن ترتیل کے اعتبار سے وہ چھوٹا ہے تو حسن تاویل کی نعمت سے ضرور بہرہ مند ہے۔ اللہ آپ کی لحد پر شبنم افشانی کرے اور آپ کے بیٹے کو محفوظ رکھے۔" [25]

سید قطب دار العلوم میں داخل ہوئے تو مختلف کتب تفسیر ان کی نظر سے گزریں اور اساتذہ سے تفسیر قرآن کا درس لیا لیکن سید کو افسوس ہوا کہ قرآن کا حسن و جمال انھیں نظر نہ آیا۔ انھوں نے اپنی روداد سفر، جو قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں طے کی تھی خود لکھی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ

بچپن میں قرآن کی تلاوت سے بعض خیالات بالکل مجسم شکل میں سامنے آتے۔ مثال کے طور پر جب وہ سورۂ حج (۱۱) کی آیت ومن الناس من یعبد اللّٰہ علی حرف فان اصابہ خیر اطمأن بہ وان اصابتہ فتنۃ انقلب علی وجھہ خسر الدنیا والآخرۃ۔ کا مطالعہ کرتے تو ان کے گاؤں کے قریب ہی وادی کا ایک خاص ٹیلہ نگاہوں میں گردش کرنے لگتا۔ اسے دیکھ کر ان کے تصور میں یہ بات آتی تھی کہ گویا ایک شخص ہے جو ایک جھکے ہوئے بلند مکان کے کنارے پر یا تنگ سے ٹیلے کی چوٹی پر کھڑا نماز پڑھ رہا ہے لیکن وہ کھڑا ہونے پر قادر نہیں بلکہ بدن کانپ رہا ہے گویا کہ گرا ہی چاہتا ہے۔ اور سید قطب اس کے سامنے کھڑے بڑے ذوق و شوق کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہے ہیں اور عجیب کیف و نشاط محسوس کر رہے ہیں۔[29]

اسی طرح سید قطب سورۂ اعراف کی ان آیات کو پڑھتے:

واتل علیہم نبأ الذی آتیناہ آیاتنا فانسلخ منہا فاتبعہ الشیطٰن فکان من الغاوین ولو شئنا لرفعناہ بہا ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث۔ (۱۷۵-۱۷۶)	اور اے نبی! ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا آخرکار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا، لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔

تو چشم تصور میں ایک تصویر ان کے سامنے آموجود ہوتی۔ وہ دیکھتے کہ ایک شخص منہ کھولے زبان لٹکائے ان کے سامنے برابر ہانپے جا رہا ہے۔ مصنف اس کے سامنے کھڑے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہتے لیکن وہ یہ نہ سمجھ پاتے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، اور قریب جانے کی جرأت بھی نہ کر سکتے تھے۔[30]

اس کے بعد سید قطب کے ذہن میں یہ اسکیم آئی کہ کیوں نہ ان قرآنی تصاویر کو عوام کے سامنے پیش کیا جائے اور ۱۹۳۹ء میں مجلہ "المقتطف" میں ایک مضمون "التصویر الفنی فی القرآن" کے نام سے شائع کر دیا اور پھر اس موضوع پر تالیف کا آغاز کر دیا اور کتاب مکمل ہونے کے بعد انہیں شدت سے محسوس ہوا کہ

ان کے دل میں ایک نیا قرآن جنم لے رہا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن پہلے بھی جمیل تھا مگر اس کا حسن و جمال منتشر اور متفرق حالت میں تھا مگر اس تصنیف کے بعد انہیں پورا قرآن متحد اور یکجا نظر آیا۔[31]

قرآن کی منظر نگاری

• مصنف نے اس کتاب میں واقعی قدرتی آیات کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ منظر نگاری کے ذریعہ حوادث و مشاہد اور مناظر و قصص ابھر کر آنکھوں کے سامنے آموجود ہوتے ہیں اور ان میں حرکت اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ان میں قوت گویائی کا اضافہ ہو جائے تو یہ زندہ کردار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جوں ہی ان کو اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے تو تماشائی بن کر سامعین مبہوت رہ جاتے ہیں۔ کلام کا سننے والا ان مناظر میں محو ہو کر بھول جاتا ہے کہ یہ الٰہی کی کتاب ہے جس کی تلاوت ہو رہی ہے یا مثالیں ہیں جو بیان ہو رہی ہیں بلکہ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ ایک منظر پیش کیا جا رہا ہے یا حادثہ وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ اس طرح یہ مناظر اسکرین پر آتے اور غائب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان واقعات و مناظر کی تبدیلی سے انسانی وجدان بھی برابر متاثر ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ زبان گویا ہو کر پوشیدہ احساسات کی غمازی کرنے لگتی ہے کہ "یہ مناظر صرف زندگی کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ بذات خود زندہ و متحرک ہیں۔"[32]

سید قطب کے نزدیک قرآنی سحر یا اعجاز بیانی کا منبع اصلی اس کے تشریعی احکام اور کائناتی علوم نہیں ہیں بلکہ قرآن کی ترتیب و تنظیم ہے جو مکی دور میں بھی معجزہ تھی اور آج تک معجزہ رہی ہے۔[33] پھر موصوف نے باغ والوں، واقعات حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ، طوفان نوحؑ، قیامت کے مناظر، راحت و عذاب کے مشاہد وغیرہ آیات قرآنی سے پیش کر کے یہ دکھایا ہے کہ یہ ذہنی و معنوی حقائق کس طرح محسوس و مجسم پیکر میں ڈھل کر معجزہ بن گئے ہیں۔

فنی نظم و نسق پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے اس کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں جن تک علمائے بلاغت کی رسائی ہو سکی ہے:[34]

۱۔ نسق کی ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق عبارت کی تالیف و ترکیب سے ہے یعنی مناسب الفاظ کو منتخب کر کے ان کو ایک خاص طریقے سے مرتب کیا جائے۔

۲۔ نسق کی ایک قسم کا تعلق صوتی ہم آہنگی اور موسیقی کے ساتھ بھی ہے جو الفاظ کے مناسب انتخاب اور ان کو ایک خاص طریقے سے مرتب کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ قرآنی آیات کے آخر میں جو فواصل لائے جاتے ہیں وہ سیاق کلام کے عین مطابق ہوتے ہیں اور ان سے تناسق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ مختلف قرآنی آیات کے نہایات و مقاصد کا معنوی تسلسل اور پھر ایک غرض سے دوسری غرض کی جانب منتقل ہونے میں جو تناسب و توافق پایا جاتا ہے وہ بھی فنی نظم و نسق کی بہترین قسم ہے۔

۵۔ غالباً فنی تناسق کی اعلیٰ ترین قسم جس سے نا بخبر علمائے بلاغت آشنا ہو سکے ہیں وہ فطری تنسق و ترتیب ہے جو بعض آیات کے تدریجی منازل و ادوار میں پایا جاتا ہے۔

لیکن مصنف کے خیال میں چونکہ علمائے بلاغت اس حقیقت سے آشنا نہ تھے کہ منظر کشی اور تصویر نگاری قرآنی تعبیر میں اصل و اساس کا حکم رکھتی ہے اس لئے وہ فنی تناسق کے موضوع کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکے۔ اس سلسلے میں سید قطب نے چند نکات پر بنیادی توجہ مبذول کی ہے:

۱۔ قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں تعبیر و بیان اور اس حالت کے مابین پوری مطابقت پائی جاتی ہے جس کی تصویر کشی مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ انداز تعبیر حسی یا لفظی معنوی تصویر کے نشانات کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ بعض اوقات صرف ایک لفظ تصویر کے اجزاء کی تکمیل میں صرف معاون ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ پوری تصویر کو لا کر پیش کر دیتا ہے۔

۳۔ قرآن کریم نے تعبیر و بیان کے لئے منظر نگاری کے جو طریقے اختیار کئے ہیں ان میں سے ایک تقابل بھی ہے۔ جہاں قرآن الفاظ کے ذریعہ نہایت نفیس تصویر کھینچنا چاہتا ہے وہاں اکثر تقابل سے کام لیتا ہے۔

۴۔ تقابل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جہاں ایک صورت موجود ہوتی ہے اور دوسری صورت کا تعلق زمانہ ماضی سے ہوتا ہے۔ قوت تخیل گزشتہ صورت کو حاضر کر کے موجودہ صورت کے ساتھ اس کا تقابل کرتی ہے [۳۵]

قصص نگاری کے اغراض و مقاصد پر سید قطب نے بڑی جامع روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک اقوام بائدہ کا تذکرہ اصلاً اثبات وحی و رسالت اور وحدت دین کے تصور کو اجاگر کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ ویسے ضمنی مقاصد اور بھی ہیں جیسے ایمان باللہ، انبیاء کے طریق دعوت کا یکساں ہونا اور ان کے

مابین اصل مشترک کی وضاحت، انبیاء کی کامیابی اور مکذبین کی تباہی، تبشیر و تحذیر کی تصدیق، انبیاء و اصفیاء پر انعامات ربانی کا تذکرہ، بنی آدم کو شیطان کی عداوت سے آگاہ کرنا وغیرہ [۳۶] اسی طرح ان واقعات میں شخصیت نگاری اور کامل انسانی نمونوں کی دریافت وغیرہ موضوعات پر سید شہید نے بڑے ادبی انداز میں رقم فرمایا ہے۔

(باقی آئندہ)

تعلیقات و حواشی

۱ لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ مصر کے علاوہ عالم اسلام میں کوئی اور قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے کیونکہ ہند و پاک کو ادبی و بلاغی تفسیر میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ربط و نظام پر علامہ شیخ علاء الدین علی بن مہائمی (م ۸۳۵ھ) کی تفسیر تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان تاسیسی کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح علامہ فراہی کا مختصر مگر جامع و نافع تحقیقی کارنامہ پوری تفسیری دنیا میں نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں مقصود کلام صرف یہ ہے کہ دنیائے عرب میں جدید دور میں قرآن سے ادبیاتی کام مصر میں زیادہ ہوا ہے۔ اسی طرح کسی کو یہ خیال بھی نہیں آنا چاہئے کہ بس یہی مذکورہ مفسرین اسی طبقہ میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مصر ہی میں عائشہ عبدالرحمٰن، مصطفیٰ صادق رافعی، ڈاکٹر زکی مبارک، ڈاکٹر عبداللہ دراز، ڈاکٹر محمد مبارک، امین خولی وغیرہ نے اس موضوع پر بیش بہا داد تحقیق دی ہے۔ لیکن بحیثیت مفسر اس طبقہ کی ترجمانی محمد عبدہ، رشید رضا، مراغی اور سید قطب ہی کرتے ہیں۔

۲ ترجمان القرآن، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، جلد اوّل کا مقدمہ، ص ۳۵ - ۴۰

۳ تفسیر القرآن الکریم (تفسیر المنار) مطبعۃ المنار ۱۳۴۶ھ جلد اوّل ص ۷

۴ نفس مصدر، ص ۱۸ — ۵ ایضاً ص ۲۵

۶ تفسیر سورۃ الفاتحہ و ست سور من خواتیم القرآن، مطبعۃ المنار ۱۳۵۲ھ ص ۳۵

۷ وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین (انفطار: ۱۰ - ۱۱)

۸ تفسیر جزء عم ص ۲۰

۹ مثال کے طور پر سورہ انشقاق اور سورہ فیل کی تفسیر میں عام رجحانات سے ہٹ کر ایسی باتیں بھی

کہ وہ ان میں بجز ست عام مسلمان متفق نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سورہ فلق کی آیت "ومن شر النفّٰثٰت فی العقد" کی تشریح میں جادو اور سحر کا انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں مراد وہ چغل خور ہیں جو الفت و محبت کے رشتوں پر قینچی چلا دیتے ہیں۔ یہاں در اصل چغل خوری کو گندے جادو گروں کے عمل سحر سے تشبیہ دی گئی ہے اور اسکے بعد بخاری کی اس صحیح حدیث کو جھٹلا دیتے ہیں جس میں رسول اکرمؐ پر جادو کی تاثیر اور لبید بن الاعصم کی کارگزاری کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح تحسین کی حدیث کل بنی آدم یمسہ الشیطان یوم ولدتہ امہ الا مریم وابنہا کی صحت سے انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر صحیح بھی ہو تو یہ ایک تمثیل ہے، حقیقت سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ دیکھیے: تفسیر جزء عم ص ۱۸۲ — ۱۸۱، تفسیر المنار جلد سوم ص ۲۹۰

۱۰ تفسیر المنار — ج ۲، ص ۴۹۸

۱۱ نفس مصدر، ج ۷، ص ۱۰ ۱۲ ایضاً ج چہارم ص ۴۲

۱۳ یہ خود استاذ رشید رضا کا دعویٰ ہے۔ دیکھیے: تفسیر المنار، ج اول، ص ۱۶

۱۴ نفس مصدر، جلد سوم ص ۹۸ — ۹۹ اور قتل عمد کے ارتکاب سے متعلق ان کا موقف دیکھیے جلد پنجم ص ۳۳۹ — ۳۴۵

۱۵ نفس مصدر، جلد ہشتم ص ۳۳۲

۱۶ مجاز و حقیقت کے سلسلہ میں ان کا موقف جلد پنجم ص ۱۳۵ — ۱۳۶ میں، سحر کے سلسلہ میں انکی رائے جلد ہفتم ص ۳۱۰ اور مجموعہ تفاسیر فاتحہ ص ۱۲۹ — ۱۳۴ میں ملاحظہ کیجیے۔ شیاطین کے سلسلہ میں تفسیر سورۂ ناس ص ۱۴۱۔ جنات کے سلسلہ میں جلد ہفتم ص ۵۱۶، جلد دوم ص ۹۶ اور معجزات کے سلسلہ میں جلد ۱، ص ۳۳۳ اور الوحی المحمدی ۱۳۵۲ھ، ص ۶۹ — ۷۰ دیکھیے۔

۱۷ بالترتیب دیکھیے: المنار ج ۲، ص ۳۱۰۔ جلد پنجم ص ۱۱۸ — ۱۲۲

۱۸ جلد ۲، ص ۱۹۹ — ۲۰۵

۱۹ سورۂ حدید کی تفسیر کا مقدمہ دیکھیے

۲۰ الدروس الدینیہ جو ۱۳۵۷ھ میں دیے گئے تھے۔ مطبعۃ الازہر ۱۹۳۹ء، ص ۶

یہی رجحان دلقیبن آل عمران آیت ۱۳۳، سورہ زمر آیت ۶۸، سورہ لقمان آیت ۱۲ کی تشریح وغیرہ میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

۲۱ الدروس الدینیہ (۱۳۵۷ھ میں دیے ہوئے) مطبعۃ الازہر ۱۹۳۹ء ص ۶ — ۷

۲۲ نفس مصدر

۲۳ 〃 〃 〃

۲۴ الدروس الدینیہ (۱۳۵۶ھ میں دیے ہوئے) ص ۴۲

۲۵ تفسیر سورۂ لقمان ص ۱۳ — ۱۴

۲۶ مثال کے طور پر سورہ بقرہ آیت ۱۸۴ کی تفسیر میں وہ علمائے فقہ کے برعکس ایک نئی رائے قائم کرتے ہیں کہ سفر میں قصر اور افطار کی اجازت ہے۔ مسافت کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ آدمی جب بھی سفر میں ہو خواہ چھوٹا سفر ہو یا بڑا، اسے نماز میں قصر کرنے اور روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ اسی طرح سورہ لقمان آیت ۲۷، سورہ ملک آیت ۵ وغیرہ میں ان کی اجتہادی شان دیکھی جا سکتی ہے۔

۲۷ ۲۸ التصویر الفنی فی القرآن، دار المعارف مصر تیسرا ایڈیشن، ص ۶

۲۹ نفس مصدر، ص ۷ — ۸ ۳۰ نفس مصدر، ص ۹

۳۱ نفس مصدر، ص ۱۰ ۳۲ نفس مصدر ص ۲۴

۳۳ نفس مصدر، ص ۱۹

۳۴ تفصیل کے لئے دیکھیے نفس مصدر، ص ۴۷ — ۴۹

۳۵ سید قطب نے ہر کتہ کی تشریح میں قرآنی آیات سے بھرپور استدلال کیا ہے، دیکھیے نفس مصدر ۷۶ — ۷۷

۳۶ اس کے علاوہ کچھ دیگر اسباب بھی قرآن میں قصہ نگاری کے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً:

۱- اس امر کا اظہار کہ اللہ تعالیٰ خوارق کی قدرت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں حضرت آدمؑ کی تخلیق، ولادت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ اور پرندوں کا واقعہ، اس شخص کا واقعہ جس کو اللہ نے اس کی موت کے ایک سو سال بعد زندہ کیا۔

۲- خیر و صلاح اور شر و فساد کے عواقب سے آگاہی۔ مثلاً: حضرت آدمؑ کے دونوں بیٹوں کا واقعہ۔

۳- انسان کی حکمت عاجلہ اور خدا کی حکمت عاجلہ میں فرق و امتیاز کرنا۔

(دیکھیے: نفس مصدر، ص ۱۲۷ — ۱۲۸)

ابن فارس اور معجم مقاییس اللغۃ

نام ونسب

آپ کا پورا نام "ابوالحسن احمد بن فارس بن زکریا بن حبیب الرازی" ہے۔ آپ کے نام ونسب اور وطن کے سلسلے میں تاریخ کی کتابوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ وطن کے سلسلے میں ایک قول "قزوین" دوسرا قول "کرسف وجیاناباذ" اور تیسرا قول "ہمذان" ہے۔

شیوخ واساتذہ

ابوالحسن کے والد شافعی مسلک کے فقیہ اور لغت کے ماہر تھے۔ فقہ شافعی کی تعلیم آپ نے اپنے والد سے سیکھی اور اسی لئے اپنی کتابوں میں اپنے ابو کے واسطے سے روایتیں نقل کرتے ہیں۔

آپ کے شیوخ میں ابوبکر احمد بن الحسن الخطیب، ابوالحسن علی بن ابراہیم بن سلمۃ القطان سرفہرست ہیں۔ موخرالذکر شیخ سے آپ نے اپنی کتاب "الصاحبی" میں کافی روایتیں ذکر کی ہیں۔ آپ کے اساتذہ میں مزید ابوالحسن علی بن عبدالعزیز، ابوبکر محمد بن احمد الاصفہانی، علی بن احمد الساوی، ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی اور ابوعبداللہ احمد بن طاہر المنجم شامل ہیں۔

تلامذہ

ابن فارس کے تلامذہ بہتیرے ہیں۔ قابل ذکر ہیں۔ بدیع الزمان الہمذانی، ابوطالب بن فخر الدولۃ البویہی، اسماعیل بن عباد اور علی بن القاسم المقری۔

وفات

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ ابن فارس کا انتقال "الری" کے شہر یا "المحمدیۃ" (الری کا کوئی محلہ ہے) میں ہوئی اور اسی شہر میں آپ کو دفن کیا گیا لیکن وفات کی تاریخ کے سلسلے میں مورخین کی پانچ رائیں ہیں۔ یاقوت نے الحمیدی کے واسطے سے (۳۶۰) ابن الجوزی اور ابن الاثیر نے (۳۶۹) ابن خلکان نے (۳۷۵) ابن خلکان نے (ابن کثیر کا ایک قول) ایک دوسری روایت میں (۳۹۰) اور القفطی نے (۳۹۵) ذکر کیا ہے۔ اسی قول کو السیوطی نے الذہبی کے واسطے سے نقل کیا ہے اور یہ قول سب سے بہتر اور راجح ہے کیونکہ اس کے

شواہد کافی ہیں۔

تالیفات

ابن فارس کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے ہر فن پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی جن کتابوں تک ہم پہنچ سکے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ الاتباع والمزاوجۃ، ۲۔ اختلاف النحویین، ۳۔ اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ۴۔ اصول الفقہ، ۵۔ الافراد، ۶۔ الامالی، ۷۔ تتمۃ الاسجاع، ۸۔ الانتصار لثعلب، ۹۔ التاج، ۱۰۔ تفسیر اسماء النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام، ۱۱۔ تمام فصیح الکلام، ۱۲۔ الثلاثۃ، ۱۳۔ جامع التاویل، ۱۴۔ الحجر، ۱۵۔ حلیۃ الفقہاء، ۱۶۔ حماسۃ المحدثۃ، ۱۷۔ الحماسۃ، ۱۸۔ خلق الانسان، ۱۹۔ دارات العرب، ۲۰۔ ذخائر الکلمات، ۲۱۔ ذم الخطا فی الشعر، ۲۲۔ ذم الغیبۃ، ۲۳۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ۲۴۔ شرح الرسالۃ الزہری الی عبدالملک بن مروان، ۲۵۔ الشیات والحلی، ۲۶۔ الصاحبی، ۲۷۔ العم والخال، ۲۸۔ غریب اعراب القرآن، ۲۹۔ فتیا فقیہ العرب، ۳۰۔ الفرق، ۳۱۔ الفریدۃ والخریدۃ، ۳۲۔ قصص النہار وسمر اللیل، ۳۳۔ کفایۃ المتعلمین فی اختلاف النحویین، ۳۴۔ اللامات، ۳۵۔ اللیل والنہار، ۳۶۔ مأخذ العلم، ۳۷۔ متخیر الالفاظ، ۳۸۔ المجمل، ۳۹۔ مختصر فی المؤنث والمذکر، ۴۰۔ مقالۃ کلا وما جاء منہا فی کتاب اللہ، ۴۱۔ المقاییس، ۴۲۔ مقدمۃ الفرائض، ۴۳۔ مقدمۃ فی النحو، ۴۴۔ النیروز، ۴۵۔ الیشکریات۔

معجم مقاییس اللغۃ

یہ معجم دوسرے معاجم سے بہت مختلف ہے کیونکہ اس میں الفاظ کی اصل سے بحث کی جاتی ہے کہ اس لفظ کی اصل کیا ہے اور کن ادوار سے گزرتا ہوا یہ موجودہ معنی میں استعمال ہو رہا ہے جس کے بعد اصلی معنی اور موجودہ معنی کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "البغل" ہے۔ مقاییس میں ہے۔ (بغل) الباء والغین واللام یدل علی قوۃ فی الجسم من ذلک البغل، قال قوم: سمی بہ لشدتہ لقوۃ خلقہ۔ وقد قالوا: سمی بغلا من التبغیل وھو ضرب من السیر الخ

(معجم مقاییس اللغۃ جلد اول ص)

یاقوت اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "کتاب مقاییس اللغۃ وھو کتاب جلیل لم یصنف مثلہ" یہ نہایت عمدہ اور بے نظیر کتاب ہے۔ اس جیسی کوئی کتاب اب تک تصنیف نہیں کی گئی۔

اس معجم کو دیکھنے کا انداز دیگر معاجم سے مختلف ہے۔ حروف کی ترتیب مندرجہ ذیل طریقے سے ہے

۱۔ پہلے انھوں نے لغت کے مواد کو کتابوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اس کا آغاز ہمزہ سے یا پر ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ پھر انھوں نے ہر کتاب کو ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا باب "الثنائی المضاعف والمطابق" (دو حرفی مضاعف) کا دوسرا "الثلاثی الاصول من الملوح" (سہ حرفی) اور تیسرا باب تین سے زیادہ اصلی حروف والے الفاظ کے لئے۔

۳۔ ایک باریکی یہ ہے کہ اوپر کی دونوں قسموں میں ایک خاص ترتیب کا خیال ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے یہ مضاعف کا ذکر کرتے ہیں جیسے اب، ات، اث، اج وغیرہ اور اسی کے بعد سہ حرفی کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو عام ترتیب پر جیسے ابت، ابث، ابد، ابح، ابز، ابس وغیرہ

یہ معجم چھ جلدوں میں ہے۔ اس کا ایک نسخہ "المدرسۃ المرویۃ بالبلاد الفارسیۃ" میں تھا۔ موجودہ نسخہ دار الکتب اسماعیلیان نجفی۔ ایران، قم، تہران سے شائع ہوا ہے اور اسی نسخے پر تحقیق وضبط کا کام عبد السلام محمد ہارون نے کیا ہے اور انھوں نے "المدرسۃ المرویۃ" کے نسخے سے استفادہ کیا ہے۔

یہ معجم خصوصیت کے ساتھ معلمین، منتہی طلبہ اور محققین کے لئے نہایت مفید ہے کیونکہ کسی زبان کو اچھی طرح جاننے کے لئے اس کے اصلی الفاظ اور حقیقی معانی تک رسائی کی ضرورت ہے اور یہ تمام چیزیں اس لغت میں موجود ہیں۔

حلقۂ یاراں

برادرم ولی اللہ صاحب! سلام مسنون

ماہ جون ۱۹۸۸ کا شمارہ نظر سے گزرا۔ "مولانا علی کا نثری سرمایہ"، "سیرت نبوی اور یونانی جہالت و فساد کی عداوت"، "ابن قتیبہ، تیسری صدی ہجری کا متکلم اسلام" وغیرہ۔ مضامین بے انتہا ستائش کے قابل ہیں۔ باقی مضامین بھی ماشاء اللہ اچھے ہیں۔ حیات نو کے ذریعہ فاضل اساتذہ کرام مولانا عنایت اللہ سبحانی، مولانا طاہر مدنی صاحبان وغیرہم سے قرآن و حدیث کے سلسلے میں استفادہ کا موقع عنایت کیجئے۔

دعوتی مضامین کی کمی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ اس کمی کو دور فرمائیں گے۔ مجھ سے مضمون کے لئے کہا ہے، ذرہ نوازی کے لئے شکریہ۔ فی الحال ایک تازہ غزل ارسال خدمت ہے۔ اگر کسی قابل سمجھیں تو "حیات نو" میں جگہ دے دیں۔ احباب کو سلام عرض۔

والسلام

سرفراز قزاقی

برادر عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

جون کا شمارہ سامنے ہے۔ آپ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اچھے مضامین آپ کو مل رہے ہیں۔ فرید صاحب کا ایک مضمون ابھی پڑھ سکا اور بعض دوسری تحریریں جستہ جستہ۔ یہ کاتب کا کرشمہ ہے یا خود فرید صاحب کا کہ سید محمد شہیدؒ کو سر کے خطاب سے نوازا ہے۔ مجھے تو مضمون نگار پر بھی سر سید کا غیر معمولی اثر دکھائی دیتا ہے ورنہ کاتب بیچارہ اتنی غلطیاں نہ کرتا۔ کم از کم چھ جگہ تو یہ غلطی کی گئی ہے۔ بعض جملے صحیح کر دیئے جائیں، مثلاً ص۱۲ پر تیسری سطر کی عبارت یوں ہونی

چاہئے تھی" اور مجاہدین و دعاۃ کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کی۔"

مضمون اپنے مشتملات کے لحاظ سے اچھا ہے۔

سیرت نبوی کا مضمون جو ۳۳ ویں صفحہ پر ہے اس کی پہلی ذیلی سرخی "اچھوتوں کی جہالت" ہونی چاہئے تھی۔ اس وقت مضمون پڑھ نہیں سکا، کچھ دوسری مصروفیات ہیں۔ بحیثیت مجموعی میرا تاثر سابقہ معیار کے برقرار رہنے کے حق میں ہے۔

دوستوں سے سلام کہئے اور دعاؤں میں یاد رکھئے۔ والسلام

طالب دعا: منور حسین فلاحی

برادرم ولی اللہ: السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جون ۱۹۸۸ء کا "حیاتِ نو" نظر نواز ہوا۔ خدا آپ کو اس کوشش میں کامیاب کرے کہ "حیاتِ نو" کا معیار متوازن ہو۔ صباح الدین ملک فلاحی کا مضمون بہت اچھا ہے۔ اسلامی ادب اور ادباء پر ایسے مضامین آنے چاہئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو ادب کے ارتقاء کی تاریخ میں سے اسلامی ادباء کا نام نکال دیا جائے تو تاریخ ناقص تو کیا رہے گی بلکہ یوں کہئے کہ بعض اصناف کی تاریخ شروع ہی نہیں ہوگی۔

"حیاتِ نو" میں "فلاح" کے طلبہ کے لئے مستقل ایک صفحہ صرف مخصوص ہونا چاہئے اس کے بڑے فائدے آئندہ نکل آئیں گے۔

خدا "حیاتِ نو" کو زندہ و تابندہ رکھے

والسلام

نظام الدین فلاحی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علمی دنیا کی اہم خبریں

پیغمبر آخر الزماںؐ کی زندگی پر محیط انسائیکلوپیڈیا

لندن میں واقع سیرت فاؤنڈیشن نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپؐ کی دعوت پر محیط ۲۵ جلدوں میں انسائیکلوپیڈیا (معارف) شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔

اب تک اس سلسلہ کی پانچ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت کے لئے ملیشیا، سعودی عرب، اور دوسرے مسلم ممالک رقم فراہم کر رہے ہیں۔ صرف پاکستان نے چھٹی اور ساتویں جلد کے لئے پچاس ہزار اسٹرلنگ پاؤنڈ فراہم کئے ہیں۔

فاؤنڈیشن کے سکریٹری جنرل نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ماضی میں علماء اور اصحاب السیر نے نبی کریمؐ کی سیرت کو پوری تفصیلات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایک دو جلدوں میں جگہ کی کمی کے باعث کما حقہ آپؐ کی سیرت کے ہر ہر پہلو کو تحقیق و تفحص کے ساتھ مفصل ذکر نہ کر سکے۔ ان پچیس ۲۵ جلدوں کے ذریعہ اس کمی کو دور کیا جاسکے گا اور یہ معارف آپؐ کی سیرت کا ایک ایک پہلو سمونے میں کامیاب ہوگا۔

یہ انسائیکلوپیڈیا ملیشیا کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اور ماریشس کے اسلامی انسٹی ٹیوٹ کے نصاب میں شامل ہے۔

ایم۔ وائی۔ پٹیل

(بشکریہ "شاہین" گجراتی ویکلی)

انسٹی ٹیوٹ آف مسلم مائناریٹی افیئرز لندن

غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کی فلاح کا ادارہ

"انسٹی ٹیوٹ آف مسلم مائناریٹی افیئرز" کا قیام تقریباً دس سال قبل لندن میں عمل میں آیا تھا جس کے بانی ڈاکٹر سید زین العابدین ہیں۔ عابدین اس ادارہ کے زیر اہتمام شائع ہونے والے رسالہ

"دی جرنل" کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں۔ یہ وہ رسالہ ہے جسے دنیا کے ۱۲۰ ممالک میں پڑھا جاتا ہے۔ خاص طور پر یہ رسالہ ان ممالک کی اہم لائبریریوں اور درسگاہوں میں ضرور پہنچتا ہے۔ اس ادارے کا قیام اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک بلین سے بھی زیادہ ہے جن میں ۳۸ فی صد مسلمان ۴۹ غیر مسلم ممالک میں اقلیت کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ ان میں طلباء، محقق، عالم، فاضل، دانشور، صحافی، تاریخ داں، سائنسداں، آکاؤنٹنٹ اور دوسرے پیشوں سے متعلق ہیں۔ یہ دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ان میں بہت کم ایسے ہیں جن کا اسلامی دنیا سے رابطہ یا تعلق ہے۔ وہ صرف اپنے ملکوں میں مصروف ہیں۔ ایسے حضرات کے علمی و عملی تجربات سے استفادہ کیا جائے۔

(بشکریہ "دعوت" ۱۶ جون ۱۹۸۸ء)

اسلامی مخطوطات کی فہرست

حکومت سعودی عرب کے "مرکز ملک فیصل" نے اسلامی مخطوطات کی ایک جامع فہرست مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مرکز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر زید عبد المحسن آل حسین نے بتایا کہ یہ مرکز اب تک تین طویل فہرستیں تیار کر چکا ہے۔ ان مخطوطات کی ایک دفتر بھی تیار کر دی گئی ہے تاکہ تحقیق کرنے والوں کو آسانی ہو اور نے محققین کو نقول، مسودات اور دیگر دفتر تک رسائی کرنے کی سہولت مہیا کی ہے۔

(رفیق منزل۔ دہلی)

جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ پانچ ممالک میں اپنی شاخیں قائم کر رہا ہے

جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے مدیر معالی الدکتور عبد اللہ عبد المحسن الترکی نے پانچ ملکوں ایس، انڈونیشیا، موریتانیا، جیبوتی، امریکہ اور جاپان میں جامعہ کی شاخیں قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ اقدام فروغ علم، تعلیم طلباء اور دعوت الی اللہ کے پیش نظر ہے۔ (اخبار العالم الاسلامی ۱۵ شوال ۱۴۰۸ھ، ۳۰ مئی ۱۹۸۸ء ص۳)

رابطہ کی جانب سے افغان پناہ گزینوں کیلئے ۱۷ ابتدائی مدارس کا قیام

سعودی عرب بھی افغان مجاہدین کے ساتھ اخوت و بھائی چارگی کا معاملہ کر رہا ہے ساتھ ہی ساتھ رابطہ عالم اسلامی بھی مجاہدین کی جانب خصوصی توجہ دے رہی ہے لہذا پشاور کے علاقہ میں افغان پناہ گزینوں کیلئے اس نے ۱۷ ابتدائی مدارس قائم کر دیئے ہیں جن میں وہ تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

(اخبار العالم الاسلامی ۱۵ شوال ۱۴۰۸ھ ص۵)

مرتب

جامعہ کے لیل و نہار

جمعیۃ الطلبہ کا انتخاب نو

۷ جون ۱۹۸۸ء کو جمعیۃ الطلبہ کے انتخاب نو کے لئے تمام طلبہ جامعہ کو مسجد میں اکٹھا کیا گیا۔ صدر محترم جناب مولانا عبد الحسیب اصلاحی صاحب نے افتتاحی کلمات کے دوران ذمہ داریوں کی اہمیت، ذمہ داران کو نصیحت اور طلبہ کے لئے ذمہ داران کی اطاعت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک امانت ہے۔ آپ خوب اچھی طرح فیصلہ کر لیں کہ آپ اپنی امانت کس کے حوالے کر رہے ہیں۔ اس امانت کے سلسلے میں روز قیامت آپ سے بازپرس ہوگی۔

صدر محترم کی گفتگو کے بعد بیلٹ پیپر تقسیم کیا گیا۔ یہ اپنی طرز کا ایک نرالا چناؤ تھا۔ بیلٹ پیپر واپس لینے کے بعد طلبہ کو مسجد سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ کچھ دیر بعد ذمہ داران کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا جو کچھ اس طرح ہیں: سکریٹری: محمد عثمان بستوی۔ لائبریرین: خالد حسن رشید۔ معتمد اردو خطابت (عربی پنجم تا ہفتم) غلام سرور۔ معتمد شعبہ عربی خطابت عربی اول تا ہفتم: عبد الحمید۔ معتمد شعبہ انگلش خطابت (اولے تا ہفتم): محمد فیاض احمد مالی۔ معتمد شعبہ اردو خطابت عربی سوم و چہارم: عبد الرب۔ معتمد شعبہ اردو خطابت عربی اول و دوم: صداقت حسین۔ اخبار و رسائل: شمس نوید۔ جنرل مینیجر: حسان اسعد فہد۔ گیم انچارج: محمد اسماعیل۔ خدمت خلق: ذو الفقار علی۔ اسٹور: عبد الشکور۔ باغبانی: عبد الرحمن۔ معتمد صفائی: اخلاق احمد اعظمی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جمعیۃ الطلبہ کا افتتاحی اجلاس

۹ جون ۱۹۸۸ء بروز جمعرات بعد نماز عشاء جمعیۃ الطلبہ کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ترانہ جامعہ کے بعد جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب نے افتتاحی کلمات کہتے ہوئے فرمایا: یہ مجلس آپ کی جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیوں کی ابتدائی مجلس ہے آپ کو اس کثیر تعداد میں دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے اور یہ آپ کی جمعیۃ الطلبہ اور اس کے پروگرام

دینی کا بیّن ثبوت ہے۔ آپ علم سیکھنے آئے ہیں علم سیکھنا اس میں گہرائی پیدا کرنا اور اس علم کو دوسروں تک پہنچانا آپ کی اولین ذمہ داری ہے۔

اس کے بعد سابق سکریٹریوں نے اپنے سابقہ تجربات پیش کئے اور سکریٹری جمعیۃ نے جمعیۃ الطلبہ کا تعارف پیش کیا۔ بعدہ جناب مولانا محمد طاہر عمری مدنی صاحب نے "جمعیۃ کا طلبہ میں رول" کے عنوان پر ایک تقریر کی۔ آپ نے فرمایا جمعیۃ الطلبہ کا قیام اور اس کی غرض و غایت جامعۃ الفلاح کے قیام سے وابستہ ہے۔ اور جامعہ کا قیام امت مسلمہ کے مقصد وجود سے وابستہ ہے۔ جمعیۃ الطلبہ طلبہ میں اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے بے شمار کامیاب ذرائع استعمال کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مزید ترقی دے۔ آمین۔

جناب مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب نے فرمایا اس مدرسے کا نظام تعلیم قرآن ہے۔ اور قرآن کی شان آفتاب کی سی ہے کہ تمام ستارے اس کے اردگرد گھومتے ہیں، اور یہی اصل ہے دیگر مدارس کے مقابلے میں اس کا مقصد قرآن کی روشنی میں عام علوم کی تدوین کے ساتھ ساتھ اس علم قرآن کو روئے زمین پر نافذ کرنے کی کوشش کرنا بھی ہے۔ یہ ایسا نصب العین ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نصب العین ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس مقصد میں کامیاب کرے۔ آمین۔ اس کے بعد جناب قاری تابش مہدی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ایک غزل سنائی اور آخر میں سرپرست جمعیۃ الطلبہ جناب مولانا سلامت اللہ صاحب اصلاحی کے اختتامی کلمات اور دعا پر اس نشست کا اختتام عمل میں آیا۔

انجمن طلبہ قدیم کی شوریٰ کا اجلاس ختم

انجمن طلبۂ قدیم کی شوریٰ کا اجلاس ۹ر جون کو شروع ہوکر ۱۰ر جون کو ختم ہوگیا اس اجلاس میں ارکان کی اکثریت شریک ہوئی۔ دیگر امور کے علاوہ بجٹ کی منظوری اور مجلہ "حیاتِ نو" کے دیگر امور طے پائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے مقصد میں مزید کامیابی عطا کرے۔ آمین۔

سکریٹری جماعت اسلامی ہند جناب سید یوسف صاحب کا طلبہ سے خطاب

۱۶ر جون ۱۹۸۸ء کو سکریٹری جماعت اسلامی ہند جناب سید یوسف صاحب جامعہ تشریف

لائے اور اسی دن بعد نماز عشاء آپ نے طلبہ سے خطاب فرمایا۔ آپ نے دستور جامعہ کے شق "مقاصد جامعہ" کی روشنی میں طلبہ سے گفتگو کی اور انھیں ان کا مقصد یاد دلاتے ہوئے کہا کہ آپ کی نوعیت دیگر مدارس سے بالکل الگ ہے۔ یہاں دینی اور عصری علوم کا بہترین امتزاج ہے آپ محنت اور لگن سے تعلیم حاصل کریں تاکہ خدا کی اس زمین پر خدا کے نظام کو غالب کر سکیں۔ اس وقت تحریک اسلامی کو باصلاحیت افراد کی سخت ضرورت ہے۔ آپ اپنے آپ کو علم و عمل سے مزین کر کے میدان میں آئیں تاکہ ہم اپنے مقصد وجود کے اپنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

عاملہ کا اجلاس

۱۶/۱۷ر جون ۱۹۸۸ء کو جامعہ کی عاملہ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں تعلیمی امور سے متعلق مختلف فیصلے ہوئے۔

ضمنی امتحانات

۴ر جون ۱۹۸۸ء سے ضمنی امتحانات شروع ہیں اور اب یہ امتحانات مکمل ہو چکے ہیں۔ ضمنی امتحانات میں شرکاء کی اکثریت بحمداللہ کامیاب ہوگئی ہے۔

عمرآباد میں جامعہ اسلامیہ مدینہ کی جانب سے تدریسی کورس

گزشتہ کئی سالوں سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی جانب سے ملک کے مختلف مدارس میں تدریسی کورس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس سال یہ کورس دارالسلام عمرآباد میں ۴ر جولائی ۱۹۸۸ء سے شروع ہو رہا ہے گزشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی جامعہ سے کچھ افراد اس تدریسی کورس میں شرکت کی غرض سے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کامیاب کرے۔ آمین۔

جامعہ میں شعبۂ تخصص کا آغاز

بحمداللہ جامعہ میں اس سال سے شعبۂ تخصص کا باقاعدہ آغاز ہونے جا رہا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا انٹرویو ۱۹ر جون کو ہوا ہے۔ دوسرے انٹرویو کی تاریخ ابھی طے نہیں ہو سکی ہے۔ انشاءاللہ تاریخ کا اعلان جلد ہی کر دیا جائے گا۔

جامعہ کے چار اساتذہ سفرِ حج پر

یہ خبر ہم تمام لوگوں کے لئے انتہائی خوش کن ہے کہ جامعہ کے چار اساتذہ جناب مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی، جناب حنیف احمد صاحب ناظم مطبخ، جناب مولوی ادریس صاحب

اور جناب حافظ ارشاد احمد صاحب سفرِ حج پر روانہ ہو رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے اعزاز میں جامعہ کی طرف سے ۲۰ر جون ۱۹۸۸ء کو ایک پارٹی رکھی گئی۔

آپ حضرات نے اپنی گفتگو میں جامعہ اور وابستگان جامعہ سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم ان شاء اللہ حج کے درمیان مخصوص مقامات پر جامعہ اور وابستگان جامعہ کو نہیں بھولیں گے اور آپ کے لئے دعائیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حج کو قبول فرمائے اور ہماری دعاؤں کو بھی شرف قبولیت عطا کرے۔ آمین۔

جامعہ کے دو اساتذہ کو الوداعی پارٹی

یہ خبر ہمارے لئے رنج و غم کا پہلو لئے ہوئے ہے کہ ہمارے دو مشفق اساتذہ جناب مولانا اقبال احمد صاحب قاسمی اور جناب ماسٹر ریاض احمد صاحب صدیقی جامعہ سے اپنی خدمات کا سلسلہ منقطع کر رہے ہیں۔ جامعہ کی طرف سے آپ حضرات کی الوداعی پارٹی ۲۰ر جون ۱۹۸۸ء کو زائرین حج کی پارٹی کے ساتھ عمل میں آئی۔

صدر محترم جناب مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی نے گفتگو کا آغاز فرماتے ہوئے کہا کہ ہمارے دو محترم ساتھی ریاض احمد صاحب صدیقی اور جناب مولانا اقبال احمد صاحب قاسمی ایک عرصہ سے ہمارے درمیان رہے ہیں اور مختلف شعبوں میں کام کرتے رہے ہیں۔ مولانا اقبال احمد صاحب نے بھی ایک طویل عرصہ تک درس و تدریس اور طلبہ کی نگرانی و تربیت کا فریضہ انجام دیا اور اسی طرح سے ماسٹر ریاض احمد صاحب نے بھی مختلف خدمات انجام دیں۔ مدرس کی حیثیت سے بھی، نگراں کی حیثیت سے بھی اور مطبخ کے منتظم کی حیثیت سے بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان دونوں ساتھیوں کی خدمات قبول فرماتے ہوئے اس کا انھیں اجر عطا فرمائے۔ آپ حضرات کا جامعہ سے تشریف لے جانا اپنی مجبوریوں کی بنا پر ہے۔ اب آپ نے جو کچھ سوچا ہے دعا ہے کہ وہ آپ کے لئے خیر و برکت ثابت ہو اور مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات جامعہ کو نہیں بھولیں گے۔ آپ ہمارے درمیان رہے ہیں ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو اسے درگزر فرمائیں گے۔

جناب ماسٹر ریاض احمد صاحب نے اپنی مجبوریوں کی بنا پر گھر پر رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ نے اپنی گفتگو میں فرمایا میں ۱۵ر اگست ۱۹۶۶ء سے جامعہ کی خدمت انجام دے رہا ہوں سچ پوچھئے تو

جامعہ میری تربیت گاہ ہے۔ جناب مولانا شہباز صاحب کو میں کیسے بھول سکتا ہوں میری تربیت کے سلسلے میں ان کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ جامعہ سے یہ تعلق ختم نہیں کروں گا حتیٰ کہ یہ بھی تھا کہ میری قبر بھی یہیں بنے گی مگر مجبوریاں یہاں رکنے نہیں دے رہی ہیں۔ میرے لئے آپ لوگ دعا کریں۔ جامعہ اور وابستگان جامعہ کو میں کیسے بھلا سکتا ہوں۔

جناب مولانا اقبال احمد صاحب قاسمی اب تدریسی اور تبلیغی خدمات کے لئے برطانیہ جا رہے ہیں وہ جامعہ سے ۲۷ر جون ۱۹۸۸ء کو رخصت ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ جامعہ سے میرا تعلق یکم فروری ۷۰ء کو قائم ہوا تھا اور بیچ میں دو مہینے کے انقطاع کے ساتھ میں جامعہ کی خدمت کر رہا ہوں۔ میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ آخر عمر تک جامعہ کی خدمت کرنی ہے لیکن حالات کچھ اس طرح ہیں کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ جامعہ اور وابستگان کو بھلانا بعید از امکان ہے۔

جناب مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کی دعا پر یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

جناب عبدالعزیز خاں صاحب کا انتقال

یہ خبر ہم تمام لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہے کہ جناب عبدالعزیز خاں صاحب اس دار فانی سے دار بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ طبیعت خراب ہونے کے بعد آپ بغرض علاج بمبئی تشریف لے گئے۔ ۳ جون کو آپ پر دورہ پڑا اور ۶ر جون ۱۹۸۸ء کو آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ۱۰ بجکر ۱۰ منٹ پر بمبئی میں آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور سانتا کروز کے قریبی قبرستان میں آپ کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ ٹھیک اسی دن تقریباً دس بجکر ۳۰ منٹ پر جامعۃ الفلاح میں جناب مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب نے آپ کی نماز غائبانہ پڑھائی۔ موصوف کی پوری زندگی اوصاف حمیدہ سے مزین تھی۔ جامعہ پر آپ کے بہت سے احسانات ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

آپ مولانا وحید الدین خاں صاحب کے سگے بھائی تھے اور آخر عمر تک جماعت اسلامی سے منسلک رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔

۱۲ر جون ۱۹۸۸ء کو جناب مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی صدر جامعہ کی قیادت میں ایک وفد تعزیت کے لئے آپ کے گھر (اعظم گڑھ شہر) پہونچا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔

جامعہ کے ایک استاذ کو صدمہ

جناب ماسٹر قمی زین العابدین صاحب استاذ جامعہ کے والد محترم ۹۵ سال کی عمر میں ۲۸، اور ۲۹ر رمضان المبارک کی درمیانی شب میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جنت عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔

ایک افسوسناک حادثہ

یہ خبر انتہائی رنج وغم کا باعث ہے کہ برادر عزیز سرفراز احمد متعلم درجہ چہارم مکتب، ساکن بریاگنج کا ۱۹ر جون ۱۹۸۸ء کو جامن کے ایک درخت سے گرنے کی وجہ سے انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بعد نماز مغرب نماز جنازہ ادا کی گئی۔ جامعہ کے طلبہ واساتذہ نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ عزیز کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پس ماندگان کو خصوصاً والدین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔

بقیہ: [illegible]

کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۴۔ انجمن کے دستور میں ترمیم کے سلسلے میں غور وخوض کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو اپنی ترمیمی سفارشات مرتب کرکے انجمن کے اگلے اجلاس شوریٰ میں پیش کرے گی۔ اس کمیٹی کے ارکان درج ذیل ہیں:
صدر انجمن نسیم فلاحی صاحب، مولانا رحمت اللہ اثری صاحب، شبیر فلاحی صاحب، اقبال احمد فلاحی صاحب اور معین الدین فلاحی صاحب۔

۵۔ چوتھے دوسالہ اجلاس کے موقع پر موصول ہونے والی تجاویز ومشوروں پر بھی غور ہوا۔

۶۔ انجمن کا بجٹ برائے ۸۹–۱۹۸۸ء پاس کیا گیا۔

۷۔ ان کے علاوہ انجمن نے نمائندہ جامعہ الفلاح کی سرگرمی میں ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں میں جامعہ کے فارغین کے داخلہ میں مدد پر [illegible] مشتمل چار ورق کتابچہ کا فیصلہ کیا۔